ماہنامہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

حیاتِ نو

کی خصوصی پیش کش

مولانا سید حامد حسین نمبر

دسمبر و جنوری ۸۵-۱۹۸۶ء

مدیر مسئول: ابوالمکارم فلاحی

مدیر: طارق فارقلیط فلاحی

قیمت فی شمارہ: ۲ روپے ۵۰ پیسے

سالانہ زرِ تعاون: ۲۵ روپے

اس شمارہ کی قیمت: ۶ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: جامعۃ الفلاح بلریاگنج اعظم گڑھ (یو۔پی) ۲۷۶۱۲۱

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ:
ایک اور چراغ بجھ گیا ۳

انٹرویو:
سید صاحب کی اپیر جواب دیتی ہیں ۱۶

سوزِ دروں:
مسلمانوں کا کوئی سیاسی موقف نہیں ہے ۵۷

حکایاتِ عزیمت:
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو ۵
داستانِ شفقت و حفاظت ۴۶
ہمارے حامد حسین صاحب ۳۶
سماج سدھار کجیب ۳۴
ایک عظیم قائد ایک عظیم مربی ۵۲
سید صاحب ۸۴
آہ! خطیبِ بزم ۹۱
اسلام کا ایک عظیم نقیب چلا گیا ۸۸
فقیری میں بھی تھی شانِ امیری ۹۳
سید حامد حسین کو جیسا میں نے دیکھا اور سمجھا ۸۰
سرگرم رفیقِ کار جدا ہو گیا ۸۲

خواتین میں دعوت کے لئے فکرمند ۹۷
یتیم لڑکی کا باپ ۱۰۰
سید صاحب ـ کچھ یادیں کچھ باتیں ۱۰۳
مولانا سید حامد حسین ایک نظر میں ۷۷
خطیبِ ہند ۱۰۵

اعترافِ حقیقت:
سہ روزہ دعوت نے لکھا ۱۰۸

احساساتِ محبت:
پاک دل و پاکباز ۱۱۳
آخری خط ۱۱۵

خراجِ عقیدت (منظومات):
پیکرِ عزیمت ۱۵
یادِ سید حامد حسینؒ ۲۵
مولانا سید حامد حسینؒ کے انتقال پر ۵۱
بر وفاتِ سید حامد حسینؒ ۷۹
منتخب اشعار ۱۰۷

جامعہ کے لیل و نہار:
جامعۃ الفلاح میرے خوابوں کی تعبیر ہے ۱۱۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اداریہ

ایک اور چراغ بجھ گیا

شمع کا کام روشنی پھیلانا ہے۔ وہ جلتی رہتی ہے پگھلتی رہتی ہے اور ماحول کی تاریکیوں کو دور کرتی رہتی ہے۔ معمولی تاریکی ہو یا گھٹاٹوپ اندھیرا، بادلوں کی گرج ہو یا چمک، بادِ نسیم کی خوشگوار ہوا ہو یا بادِ صرصر کے تیز و تند جھونکے وہ جلتی رہتی ہے کبھی اس کی لو تیز ہوتی ہے، کبھی مدھم۔ کبھی ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور کبھی کپکپاہٹ، مگر وہ سوز و درد سے پگھلتی رہتی ہے اندھیرے سے کبھی مصالحت نہیں کرتی

حضرت نوحؑ بھی جلے تھے، شمع کی طرح پگھلے تھے اور مسلسل ساڑھے نو سو سال تک جلتے رہے تھے۔ سوز و درد سے، خوفِ آخرت سے۔ ایک ایک فرد کے پاس گئے، گاؤں گاؤں کی خاک چھانی، قریہ قریہ پھرے، شہر شہر دورہ کیا۔ تنہائیوں میں ملے، مجمع سے خطاب کیا، اکیلے میں سمجھایا تاکہ لوگ اپنے دلوں کی تاریکیوں کو دور کرلیں۔ خدا کے نور سے، اس کی محبت کی روشنی سے اپنے قلب و جگر کو منور کرلیں، ایمان سے بھر لیں، یقین سے معمور کرلیں۔ کتنے اچھے تھے حضرت نوحؑ! کتنی محبت تھی ان کے سینے میں اور کتنا غم تھا اپنی قوم کا ـــــ مگر وہ لوگ نہ مانے، اپنی آنکھیں بند کرلیں اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں کپڑے ٹھونس لئے ـــــ تب حضرت نوحؑ نے درد سے پکارا: "اے میرے رب میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کردے، انھوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لئے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا" اور نوحؑ نے کہا "میرے رب، ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا

نہ چھوڑ اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی ہوگا بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا" تفہیم القرآن سورہ نوح ۱

اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی غم کی آگ میں جلے، شمع کی طرح پگھلے، پروانے کی طرح تڑپے، تاکہ لوگ ایمان لے آئیں، خدا کو جان لیں اس کو پہچان لیں اس کا کہا مان لیں، مکہ کی گلیوں میں طائف کی وادیوں میں، ابو طالب کی گھاٹیوں میں، بدر کے میدان میں، احد کی چٹانوں میں، تکلیفیں اٹھائیں، گالیاں سنیں، پتھر کھائے، لہولہان ہوئے، ایک کلمے کے لئے لا الٰہ الا اللہ کی توضیح کے لئے، محمد رسول اللہ کے اقرار کیلئے ـــــ ۱۳ سال تک نہیں بلکہ ۲۳ سال تک، کتنا سوز تھا آپ کے اندر، کتنا درد تھا آپ کے دل میں اور کتنی محبت تھی آپ کے قلب میں۔ آپ پگھلتے رہے روشنی بکھیرتے رہے، اندھیرے سے لڑتے رہے یہاں تک کہ خدا کو پیار آیا، محبت سے فرمایا "اچھا تو اے نبی! شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے" تفہیم القرآن سورہ کہف

اور پھر انہیں کے ایک پیرو نے اپنے آپ کو حق کے سپرد کر دیا، تحریک کے لئے وقف کر دیا، چراغ کی طرح جلتا رہا، شمع کی طرح پگھلتا رہا، پروانے کی طرح تڑپتا رہا، صرف اس لئے کہ لوگ اسلام کو سمجھ لیں، پورے دین میں داخل ہو جائیں، اسلام کا نمونہ بن جائیں۔ اور تمام لوگوں تک اسلام کا پیغام پہونچ جائے۔ عذر باقی نہ رہے حجت تمام ہو جائے۔ آقا راضی ہو جائے، مالک خوش ہو جائے۔

گلی گلی گھوما، قریہ قریہ گیا، بستی بستی کی خاک چھانی، شہر شہر دورہ کیا، ایک ایک فرد سے ملا، تنہائی میں سمجھایا، مجمع سے خطاب کیا، تربیت کا پروگرام بنایا، دعوت کا ڈھنگ بتایا اور اپنی تمام توانائیاں لگاتا رہا ـــ مسلسل پیہم ـــ ۳۶ سال تک اور جب اس دیار میں پہونچا جس سے اسے نسبت خاص تھی تو واپس آنا گوارہ نہ کیا اور وہیں قریب ہی سو رہا میں نے کہا کہ وہ ایک داعی تھا جس کو ان دونوں سے نسبت تھی چاہے وہ خاک طیبہ کی کیوں نہ ہو اور آپ نے کہا وہ حامد حسینؒ تھا یوپی کا امیر حلقہ، امت مسلمہ کا بے مثل خطیب، مسلمانان ہند کا بیباک لیڈر، تحریک اسلامی کا عظیم مجاہد۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ط

[illegible] ۲۲ [illegible]

نرم دم گفتگو گرم دم جستجو

طاہرہ فاروقی فلاحی

شاعر اعظم علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اشعار میں جگہ جگہ مومن کامل کی تصویر کشی کی ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کا یا اسلام کا مطلوب انسان کیسا ہوتا ہے اس کے اندر کس طرح کی خوبیاں پائی جاتی ہیں، عقیدے کے لحاظ سے اس کا یقین خالق کائنات کے اوپر غیر متزلزل ہوتا ہے۔ عزم و ارادہ کے لحاظ سے وہ مرد آہن ہوتا ہے۔ حالات و واقعات اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں پیدا کرتے۔ وہ ہر وقت زمانے کے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھتا ہے اور تدبر و تفکر کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے اندر بلا کی حرکت پائی جاتی ہے۔ وہ سیماب صفت ہوتا ہے۔ گفتار، کردار اور اخلاق میں وہ اللہ کی برہان ہوتا ہے۔ اس کے اندر قہاری، غفاری، قدوسی اور جبروت کی صفتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ فطرت کا رازداں، دنیا میں حق کا میزان ہوتا ہے۔ وہ شبنم کے اس قطرے کی طرح ہے جس سے لالہ کا جگر ٹھنڈا ہو جائے اور اس طوفان کی طرح ہے جس سے دریاؤں کے دل دہل جائیں۔ وہ کہتے ہیں

ہو نرم دم گفتگو گرم دم جستجو رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

علامہ اقبال اپنی پوری زندگی تلاش کرتے رہے مگر ان کو قرآن کا مطلوب انسان نہ ملا۔ اربوں انسانوں کی اس دنیا میں اور کروڑوں مسلمانوں کی آبادیوں سے مرد مسلماں کو تلاش کر لینا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن علامہ اقبالؒ پھر بھی مایوس نہیں ہوئے وہ تلاش کرتے ہی رہے بالآخر اورنگ آباد میں پیدا ہونے والے ایک شخص پر ان کی نظر پڑی اور انھوں نے اس کو مومن کامل سے قریب تر پایا، اور لاہور آنے کی دعوت دی۔ پھر زندگی نے وفا نہ کی ورنہ اقبال کی تیز نظروں نے جس شخص کی زندگی کا ایک رخ دیکھا تھا اس کی اگر پوری اور مکمل زندگی کو دیکھتیں تو مسرت سے پھولے نہ سماتیں اور وہ

پکار اُٹھتے پالیا —— میں نے پالیا —— مرد کامل —— مرد مومن کو پالیا ——

اس شخص کو پیارے لوگ مولانا مودودیؒ کہتے ہیں۔ لیکن اقبالؒ اور رومیؒ اگر زندہ ہوتے تو میں ایک شخص اور شخص کو دکھاتا جو ۲۶ سال تک کبھی ریل کی چھتی اور سخت لکڑی کی سیٹ پر اور کبھی بس کی بھی پرانی گدی پر اور کبھی کبھی کھڑے کھڑے پورے ہندوستان کا چکر لگاتا رہا اور دعوتِ دین کو عام کرتا رہا۔ وہ نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو تھا۔ اس کے غیر متزلزل ایمان ویقین نے کتنے ہی کمزور ایمان والوں کو زندگی بخشی دی اور کتنے ہی بھولے بھٹکے لوگوں کو راستہ کا پتہ بتایا۔ وہ جب تقریر کے لئے کھڑا ہوتا تو دلوں کو مسخر کرلیتا اور ہزاروں ممولوں کو شاہین کا جگر بخش دیتا۔ وہ گفتار وکردار میں اللہ کی برہان تھا۔ اس کے اندر قہاری، غفاری، قدوسی اور جبروت کی صفتیں نمایاں تھیں۔ وہ لالہ کی جگر کو ٹھنڈک بخشنے والی شبنم کا قطرہ تھا وہ دریاؤں کے دل ہلا دینے والا طوفان تھا —— وہ —— یو۔پی۔ کا امیر حلقہ تھا —— سیّد حامد حسین تھا۔ اقبال کا مرد مومن تھا —— مودودی کا مرد مجاہد تھا۔

مولانا سیّد حامد حسینؒ اچل پور سٹی ضلع امراوتی مہاراشٹر میں فروری ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی عیش وعشرت اور خاندانی غرور ونخوت میں کافی مشہور تھا۔ اس کو نظام حیدرآباد نے خلعت اور اراضی عطا کی تھی۔ خاندان کا بزرگ آج بھی اس خلعت کو پہن کر عید، بقرعید کو خطبہ دیتا ہے۔ آس پاس کے علاقوں پر اس کی چودھراہٹ قائم تھی اور اس کو دوام بخشنے کی سعی وجہد برابر جاری تھی۔

تصور کیا جاسکتا ہے کہ ایسے گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے کا مزاج کیا ہوگا اور اس کی تربیت اور پرورش کس نہج پر کی جائے گی۔ چنانچہ سیّد صاحب کے اندر بھی وہ تمام چیزیں موجود تھیں جو ان کے بڑے اور بزرگوں میں پائی جاتی تھیں۔ سیّد صاحب کی عربی اور اردو تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی البتہ آپؒ نے شعوری اسلام اختیار کرنے کے بعد اپنے مطالعہ کو بڑھایا اور اس حد تک بڑھایا کہ دل ودماغ ایک لائبریری بن گیا۔ سیّد صاحب کی تعلیم انگلش میڈیم میں ہوئی۔ وارنگل کے ایک اسکول میں آرٹ ٹیچر رہے اور پھر انگریز فوج میں ملازم ہوگئے اور شب وروز یونہی بابرِ عیش کوش کی طرح گزرتے رہے۔ سیّد صاحب انتہائی آزاد خیال اور فیشن پرست انسان تھے۔ سینما دیکھنا روزمرہ کا معمول تھا اور کبھی کبھی رقص وسرود دیکھتے تھے لیکن کسے معلوم تھا کہ اس انتہائی آزاد خیالی

فیشن پرستی اور سینما بینی کے اندر ایک مرد مجاہد، انسان کامل اور مرد مومن چھپا ہوا ہے جو وقت کے انتظار میں ہے۔

سیّد صاحب نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ انتہائی پُر آشوب دور تھا۔ پہلی جنگ عظیم سیّد صاحب کی پیدائش سے پہلے ختم ہوچکی تھی اور لاکھوں انسان مارے گئے اور دوسری جنگ عظیم کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ امن عالم خطرے میں تھا اور پوری دنیا بارود کے ڈھیر پر تھی۔

امتِ مسلمہ کا تو اور بھی برا حال تھا۔ غلامی کا پٹہ گلے میں ڈالے شاکر ومطمئن تھی اور ہر جگہ اس کی عزت وناموس انگریزوں کے جوتوں تلے روندی جارہی تھی۔ غلامی کی یہ زنجیریں دن بدن اس کو کمزور کرتی جارہی تھیں۔ ہر طرف کشت وخون کا بازار گرم تھا۔ خلافت کے تاروپود بکھر گئے تھے اور پوری امتِ مسلمہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ ہندوستان میں بھی مسلمان بری طرح مایوسی کا شکار تھے۔ مستقبل تاریک نظر آرہا تھا اور ان کی کوئی منظم آواز نہیں تھی۔ تاہم ہندوستان دوسرے ممالک کے لحاظ سے بہتر تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی نے مسلمانوں کے اندر زندگی کی روح پھونکنا شروع کردیا تھا اور آزادی کی ایک تحریک شمال سے جنوب تک، مشرق سے مغرب تک چل پڑی تھی۔ یقیناً ان عالمی حالات اور مقامی حالات نے مولانا کی زندگی پر اثر ڈالے ہوں گے اور ان کے اندر سوئے ہوئے مرد مومن کو پیدا ہونے میں مدد دی ہوگی۔

ریاست حیدرآباد جہاں نظام کی حکمرانی تھی بد انتظامی کا شکار تھی اور اس مقام پر پہونچ چکی تھی جہاں قانون فطرت خود بخود اقتدار دوسروں کے حوالہ کردیتا ہے۔ زوال پذیر اخلاق باختہ اور غلام قوم کے اندر جو چیز سب سے زیادہ رواج پاتی ہے وہ ناچ گانا، شعر وشاعری، کھیل، تماشہ، جوا، شراب، لڑائی جھگڑا اور ایسی دوسری تمام معیوب چیزیں اور ریاست حیدرآباد میں بھی یہ تمام چیزیں موجود تھیں۔ شعراء کی محفلیں جمتیں، مشاعرے ہوتے، اشعار پیش کئے جاتے اور گل وبلبل کی داستانیں جھوم جھوم کر سنائی جاتیں۔ اشعار اور مشاعرے سیّد صاحب کی کمزوری تھے۔ کوسوں دور مشاعرہ ہوتا اور سیّد صاحب پہونچ جاتے۔ انھیں مشاعروں میں کہیں اقبالؒ کا تعارف ہوا اور ان کے اشعار ان کی کمزوری بن گئے اور ان کے اندر کے مرد مومن کو ایک چابک اور رسید کیا۔

انھیں دنوں دور حاضر کے امام مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمہ کی ایک طاقت ور آواز

نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا اور پھر دھیرے دھیرے وہ طاقت ور ہو گئی۔ بالآخر ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو اس نے ایک جماعت کی شکل اختیار کر لی اور پھر کتابوں کی شکل میں، اخبار و رسائل کی شکل میں، بحث و مباحثہ کے ذریعہ فتویٰ بازی اور مخالفت کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلتی چلی گئی۔ یہی آواز سید صاحب کے پاس کتابوں کی شکل میں پہونچی اور سید صاحب نقد دل ہار بیٹھے۔ سویا ہوا مرد مومن بیدار ہو گیا اور ۱۹۴۸ء میں باقاعدہ جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی۔ طارقؒ نے اپنی کشتیاں جلائی تھیں لیکن سید نے اپنی پچھلی زندگی جلا ڈالی اور کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا برابر آگے ہی بڑھتے رہے۔

سید صاحب جس دور میں جماعت اسلامی میں شامل ہوئے وہ ہندی مسلمانوں کے لئے ایک نہایت نازک ترین دور تھا۔ لاکھوں آدمی تقسیم ملک کے وقت پاکستان چلے گئے۔ مسلم فوج، تاجر، پڑھے لکھے لوگ، لیڈر سبھی پاکستان سدھار گئے۔ جماعت اسلامی کے سرکردہ لیڈر اور بہترین افراد نے پاکستان کی راہ لی اور جماعت بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہندوستان میں جو مسلمان رہ گئے تھے وہ کمزور، بے سہارا اور بے آواز تھے۔ اس کے بعد یک طرفہ مسلم کشی کی جو ہوا ملک میں چلی، اس نے ہندوستان کو مسلمانوں کا مقتل بنا دیا۔ دلی، لکھنؤ، کانپور، امرتسر، پنجاب، پٹیالہ، ان تمام جگہوں پر مسلمان مولی گاجر کی طرح کاٹ ڈالے گئے اور ہندوستان کی زمین معصوم مسلمانوں کے خون سے رنگین ہو گئی۔ جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے مگر کچھ نہ کر سکے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہ تھا۔ وہ خوف زدہ، مایوس اور دل شکستہ تھے۔ ان کے مال و اسباب، گھر بار سب تباہ کر دیئے گئے تھے اور خاندان کا خاندان شہید کر دیا گیا تھا۔

ہندوستان کی جماعت اسلامی اگرچہ بہت ہی کمزور تھی اور بالکل نئی نئی قائم ہوئی تھی وسائل و ذرائع بے حد محدود تھے تاہم اس وقت اس کے سامنے دو اہم کام تھے ایک مسلمانوں کے اندر سے خوف و ہراس دور کرنا، ان کے اندر خود اعتمادی اور جینے کا حوصلہ پیدا کرنا اور ان کو ایک با مقصد زندگی گذارنے پر آمادہ اور منظم کرنا، دوسرے غیر مسلموں کے دلوں میں پیدا شکوک و شبہات کو دور کرنا،

لیکن اس کے لئے جماعت اسلامی کے اندر افرادی کمی سب سے زیادہ مانع تھی۔ مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی نے اپنے مسلسل مضامین "زندگی کے اشارات" اور تقریروں کے ذریعہ جہاں اس خدمت کو انجام دیا وہیں پر مولانا سید حامد حسینؒ نے ہندی مسلمانوں کو جینے کا حوصلہ دیا۔ وہ یکم اگست ۱۹۵۱ء تا ۳۱ جولائی ۱۹۵۳ء ریاست حیدرآباد کے نائب قیم رہے اور پھر یکم اگست ۱۹۵۳ء تا ستمبر ۱۹۵۸ء حیدرآباد کے قیم رہے۔ واضح رہے کہ امیر حلقہ کے لئے اس وقت قیم کی اصطلاح تھی۔

مولانا نے اپنے قیمی کے زمانے میں انتھک جد و جہد کی، مسلسل اور پیہم دورے کئے اور جماعت اسلامی کی دعوت اور پیغام کو عام کیا۔ ہمیشہ اپنے پاس کتابیں رکھتے اور جہاں جاتے لے جاتے۔ انفرادی ملاقات، اجتماعی پروگرام، خطاب عام، سمپوزیم، مسلم معززین شہر اور غیر مسلم معززین سے خطاب اور سوال و جواب کے ذریعہ اسلام کا پیغام گھر گھر پہونچایا۔

رفقاء کی ہمہ جہتی تربیت کے لئے تربیتی اجتماعات، تربیتی کیمپ منعقد کئے۔ قرآن و حدیث کے اجتماعی مطالعہ، لٹریچر کی تفہیم، مشقی تقاریر اور سوال و جواب کے ذریعہ رفقاء کی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔

جماعت اسلامی اپنے قیام کے پہلے ہی دن سے حکومت کی نظروں میں بری طرح کھٹکتی رہی ہے اس نے کبھی اس کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے اور بار بار اس کے لیڈروں کو جیل کی کال کوٹھریوں میں ڈھکیلا گیا۔ ہر کارکن کے پیچھے خفیہ پولس لگا دی گئی اور طرح طرح کی لالچ اور دھمکی سے ان کو پریشان کیا گیا۔ اور پسند آتی بھی کیسے حکومت کی پالیسی کچھ اور تھی اور جماعت اسلامی کی پالیسی کچھ اور۔ حکومت چاہتی تھی کہ مسلمانوں کی زبان، ان کا کلچر، ان کی تہذیب، ان کا مذہب اور پرسنل لا، دھیرے دھیرے بتدریج ختم کیا جائے اور پھر ان کو ہندو قومیت میں ضم کر لیا جائے جس کا خوبصورت نام حکومت نے قومی دھارا رکھا ہے۔ حکومت کے اس مقصد کے حصول میں جماعت اسلامی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی۔ اس نے مسلمانوں کو بیدار کیا اور اسلام کو جیسا کہ وہ تھا ایک ہمہ گیر نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کیا۔ عصری اسلوب میں قطعی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ اسلام ہر زمانے کے لئے اور ہر اس قوم کیلئے ہے جو اس کو اپنائے۔ دنیا کے سارے مسائل کا حل اسلام میں موجود ہے۔ اسلام امن، سکون، چین،

اور شانتی کا پیغام ہے جو بیقرار اور پریشان حال انسانیت کے لئے ایک نسخۂ کیمیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کو بتایا کہ تم ایک قوم نہیں بلکہ خیر امت ہو جو دنیا میں نیکیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے کے لئے بھیجی گئی ہے۔ اپنے گریباں میں منھ ڈال کر دیکھو اور بنی اسرائیل کی طرح "نحن ابناء اللہ واحباءہ" کا نعرہ لگانا چھوڑ دو۔ حالات کی رفتار اور واقعات کی نبض کو پہچانو، دشمن کی چالیں بڑی گہری اور سازشیں بڑی کامیاب ہیں۔ اس نے تمہارے خلاف ایسا باریک جال بچھا دیا ہے جو ہم رنگ زمیں ہے جس سے بچ نکلنا آسان نہیں ہے۔ اپنے مذہب پر جم جاؤ اور نیکیوں کے نقیب بن جاؤ۔ جماعت اسلامی کا یہ جرم حکومت برداشت نہ کر سکی۔ اس نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں جماعت کی قیادت کو زنداں کے حوالے کیا اور ارکان کو طرح طرح سے خوف میں مبتلا کیا۔ اس نے سوچا کہ ابھی ابھی جماعت تقسیم ہوئی ہے اور فسادات نے رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دیا ہے۔ مسلمان خود مایوس اور دل شکستہ ہیں ایسے میں جماعت کی قیادت کو اندر ڈالنا جماعت کو ختم کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ لیکن اللہ کی مہربانی جماعت ثابت قدم رہی۔ ایسے نازک ترین لمحات میں جس کی قیادت اور رہنمائی پر بھروسہ کیا گیا ان میں مولانا سید حامد حسینیؒ بھی تھے۔ علامہ اقبالؒ نے مغرب کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر بھی اپنے دامن کو تر ہونے سے بچا لیا تھا اور مغرب کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا ؏ شاخ نازک پہ جو آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا اور سیدؒ نے اپنے مغربی تہذیب سے تر بتر دامن کو اس طرح نچوڑا کہ فرشتے بھی وضو کے لئے ترس ترس گئے۔ اور پھر انتہائی اعتماد، یقین اور عزم کے ساتھ اسلام کی آواز لگائی کہ باطل کے در و بام ہل گئے۔ وہ بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی بن گئے۔ جس سے ہزاروں لوگوں نے اپنی منزل کا راستہ معلوم کیا۔ ان کی آواز نے ہزاروں قدموں میں ثبات پیدا کیا اور ہزاروں دلوں کو نیا عزم و نیا حوصلہ دیا۔ سارے ملک کا دورہ کر کے کمزور اور پژمردہ ایمان والوں کو قوت ایمانی بخش دی، ان کے دلوں میں گرمی اور لہو میں حرارت پیدا کیا۔ انھوں نے بتایا ؏

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

سید صاحب دسمبر ۱۹۵۱ء سے ۱۹ ستمبر ۱۹۸۵ء تک تاحیات مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی کے رکن رہے اور ۱۹۵۱ء سے ۱۹ ستمبر ۱۹۸۵ء تک تاحیات غیر علاقائی بنیاد پر مجلس نمائندگان

کے رکن رہے مرکزی شعبۂ تنظیم سے وابستہ رہے اور یو۔ پی۔ کے امیر حلقہ بھی۔ جولائی ۱۹۵۱ء تا جون ۱۹۵۶ء میں پہلی بار یو۔ پی۔ کے امیر حلقہ منتخب کئے گئے۔ اور پھر جون ۱۹۶۳ء تا اپریل ۱۹۸۱ء تا ۱۹ ستمبر ۱۹۸۵ء تاحیات یو۔ پی۔ کے امیر حلقہ رہے اور بالآخر سفر حج سے واپسی کے موقعہ پر جدہ میں کار کا حادثہ ہوا، سر اور سینے میں چوٹ آئی اور اسی موقع پر ہارٹ اٹیک بھی ہوا اور اس طرح راہ حق کا یہ عظیم مجاہد ۲۰ ستمبر ۱۹۸۵ء کی صبح جام شہادت نوش کر لیا۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مولانا کی زندگی پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ ان ہستیوں میں سے تھے جو ہزاروں گردش لیل و نہار کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اور جس کے انتظار میں سالہا سال تک نرگس و نسترن آنسو بہاتی ہیں۔ مولانا پورے ہندوستان میں بلحاظ مذہب و ملت، امیر غریب، جاہل، عالم ہر طبقہ میں ایک بہترین خطیب، جادو بیان مقرر، شیریں مقال واعظ کی حیثیت سے مقبول و معروف تھے۔ آپ جب بولتے تو مجمع پر سناٹا طاری ہو جاتا۔ محویت کے عالم میں لوگ تقریر سنتے اور آپ کے چہرے کو تکتے رہتے۔ الفاظ بارش کی طرح برستے اور دل و دماغ کی دنیا کو زیر و زبر کر دیتے۔ شخصیت طرحدار، آواز دلکش اور گرجدار تھی۔ دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹے گذر جاتے اور سننے والوں کو احساس نہ ہوتا۔ انگریزی اصطلاحیں اس سلاست اور روانی سے استعمال کرتے کہ تقریر میں ایک حسن پیدا ہو جاتا۔ آپ کی تقریریں اس جگہ بھی کامیاب ہوئی ہیں جہاں لوگ اکثر ناکام ہو گئے ہیں۔

آپ مصنف نہ تھے لیکن مطالعہ گہرا اور عمیق تھا۔ حالات حاضرہ پر گہری نظر تھی اور واقعات و حالات کے نبض شناس تھے۔ آپ کا یہ پختہ یقین تھا کہ دنیا کا مستقبل اسلام سے وابستہ ہے اور ہندوستان کی فلاح اسلام سے وابستگی میں ہے اور یہ برس ہا برس کے مطالعہ کا حاصل تھا۔ اسی لئے آپ کی تقاریر میں اتنی خود اعتمادی اور یقینیت پائی جاتی تھی گویا آپ مستقبل کو حال کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں: "ہمارے خیال میں ان سارے مسائل کا حل صرف اسلام ہے اور دنیا امن و شانتی کا گہوارہ صرف اسی وقت بن سکتی ہے جب کہ انسانیت اسلام کے اصولوں کے مطابق اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کی تعمیر کرے۔ ہمارا یہ خیال محض اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہم

مسلمان ہیں اور یہ ہمارے ایمان کا ایک لازمی تقاضہ ہے۔ بلکہ ہم عقل اور تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ اسلام کے سوا جو حل بھی اب تک پیش کئے جا چکے ہیں یا کبھی پیش کئے جائیں گے وہ بجائے خود عالمگیر بگاڑ کے باعث ہیں اور ہوں گے۔" تقریر بعنوان "ایک صالح نظام کی ضرورت" اجتماع رام پور۔

ہندوستان میں 'قومی دھارا' کی اصطلاح بالکل عام ہے اور مسلمانوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ 'قومی دھارے' میں شامل ہو جائیں۔ مولانا مرحوم فرماتے ہیں: "اگر قومی دھارے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان[1] اپنا نام، اپنے مراسم عبودیت اور چند مذہبی عقائد و رسوم کے سوا اپنی تہذیب و ثقافت، اپنے قانون وراثت، اپنے طریقہ نکاح و طلاق، اپنی زبان و لباس، اپنی سماجی زندگی کا طرز غرض اپنی ملی انفرادیت اور تشخص ختم کر کے اکثریت کے طرز زندگی کو اختیار کر لیں یا ملک کے مختلف گروہوں سے اخذ کردہ کسی مشترکہ ہندوستانی تہذیب وغیرہ کو اپنا لیں تو اس طرح کا مشورہ اور مطالبہ کئی پہلوؤں سے سخت قابل اعتراض نیز یہ مشورہ ملک اور مسلمانوں کے لئے انتہائی مہلک ہے۔"

دوسرا مشورہ یہ دیا جاتا ہے کہ کانگریس کو چھوڑ کر اور کوئی پارٹی یا گروہ مسلمانوں کی حفاظت نہیں کر سکتی اس لئے مسلمانوں کو کانگریس کو ووٹ دینا چاہئے بلکہ اس میں شامل ہو جانا چاہئے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"کانگریس دیگر سماجی جماعتوں کی طرح ایک ایسی آئیڈیالوجی یعنی اسلام کی بالمقابل ضد واقع ہوئی ہے۔ اسلام اگر اللہ کا نازل کردہ دین اور طریقہ زندگی ہے تو اس کے سوا بقیہ تمام طریقہ ہائے زندگی جن میں سے ایک کی علمبردار کانگریس بھی ہے انسانوں کی دماغ کی پیداوار ہیں جس طرح یہ بات بالکل غلط ہے کہ ایک کمیونسٹ اپنے عقیدہ اور آئیڈیالوجی کے خلاف کسی ایسی جماعت کو ووٹ دے یا اس میں شریک ہو جائے جو کمیونزم کے بجائے سرمایہ داری کے نظام کو ملک میں قائم کرنا چاہتی ہو۔ بالکل اسی طرح یہ کیسے درست ہو سکتا ہے کہ اسلام پر ایمان رکھنے والا گروہ یعنی مسلمان کسی ایسی جماعت کو ووٹ دیں یا اس میں شریک ہو جائیں جو عقیدہ اور آئیڈیالوجی کے لحاظ سے اسلام سے مختلف بلکہ متصادم ہو۔"

مولانا مزید فرماتے ہیں کہ "بلاشبہ ووٹ ایک بہت بڑی دولت اور طاقت ہے جو مسلمانوں

لہ اور بلاشبہ قومی دھارا کا یہی مفہوم ہے

کو حاصل ہے لیکن انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ ان کے پاس ووٹ سے زیادہ قیمتی دولت ایمان کی اور زبردست طاقت اسلام کی ہے جس کی خاطر دنیا کی ہر دولت قربان کی جا سکتی ہے، وہی مومن کے ایمان کا تقاضہ ہے۔"

سید صاحب کی پوری زندگی جہاں دعوت اسلامی کو عام کرنے میں گذری وہیں ان کو بار بار اس سوال کا جواب دینا پڑا کہ جماعت اسلامی کے ارکان ووٹنگ میں حصہ کیوں نہیں لیتے اور اپنے قیمتی ووٹوں کو کیوں محفوظ کئے رکھتے ہیں۔ اوپر کی عبارتوں سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے لیکن جب جماعت اسلامی کی مرکزی شوریٰ نے ۲۵ فروری ۱۹۸۵ء کو یہ پابندی اٹھالی تو سید صاحب عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گئے جماعتی مصالح اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ مرکزی شوریٰ کے فیصلے کے خلاف ایک حرف بھی کہا جائے لیکن دل اندر سے مطمئن نہ ہوتا تھا اور سید صاحب کے ساتھ ہی یو۔پی۔، بہار، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش وغیرہ صوبوں کے ارکان کی اکثریت غیر مطمئن ہو گئی اور اضطراب کی کیفیت بڑھتی گئی۔ سید صاحب اپنے اطمینان قلب کے لئے جہاں دلائل تلاش کرتے رہے وہیں یو۔پی۔ کے رفقاء کے اضطراب کو دور کرنے کے طریقے بھی سوچتے رہے تا آنکہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

سید صاحب جماعت اسلامی ہند کے چوٹی کے لیڈروں میں سے ایک تھے بلکہ کہنے والے نے تو یہاں تک کہا کہ جماعت اسلامی جن پانچ بوڑھوں پر قائم ہے ان میں سے ایک سید صاحب بھی تھے۔ آپ کے اندر بہترین خطابت کے ساتھ ساتھ تنظیمی صلاحیتیں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں، وقت کے پابند اور ڈسپلن کے پکے تھے یہ پابندی اور ڈسپلن جماعتی اور تنظیمی زندگی کے علاوہ گھریلو اور انفرادی زندگی میں بھی بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔ یو۔پی۔ جیسے بڑے صوبہ کا امیر حلقہ رہنا اور کم و بیش دس سال تک چھائے رہنا ایک جنوبی لیڈر کے لئے غیر معمولی واقعہ ہے۔ اور اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا غماز بھی۔ یو۔پی۔ جو ہندوستان کا دل ہے جو بڑے بڑے لیڈروں کا مولد و مسکن رہ سکتی ہے اور جو پورے ہندوستان کو کنٹرول کرتا ہے اور جہاں جماعت اسلامی کے ارکان کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔

یو۔پی۔ جہاں بے شمار علماء پائے جاتے ہیں دینی مدارس کا ایک جال بچھا ہوا ہے اور جہاں لوگوں کی عزت علم، تفقہ فی الدین، تقویٰ اور پرہیزگاری کی بنیاد پر ہوتی ہے جہاں سید صاحب کی مقبولیت

اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آپ صحیح معنوں میں ایک مدبر اور ایک زعیم خیر کوش تھے۔

سید صاحب نے ایک داعی کی زندگی گذاری۔ سادہ لباس، سادہ انداز، پاکیزہ کلام، ان کی پہچان اور اسلام کی دعوت ان کا مشن تھا۔ مسلم اور غیر مسلم بندگان خدا کو انھوں نے تڑپ تڑپ کر اور پلٹ پلٹ کر بار بار پکارا۔ اتقاریر کے ذریعہ، انفرادی ملاقاتوں اور خطابات عام کے ذریعہ، بڑے اعتماد، یقین اور عزم و ہمت سے پکارا۔ یہاں تک کہ یہ پکار ان کے دلوں کی دھڑکن بن گئی اور لوگ کھنچ کھنچ کر جماعت کی طرف آنے لگے اور آج یوپی میں جو کام بھی پایا جاتا ہے سید صاحب کی کوششوں کا بڑا حصہ ہے۔ سید صاحب آخر وقت تک اسلام کے پیغام محبت کو عام کرتے رہے۔

خدا بخشے بڑی ہی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

بقیہ: سید صاحب:

نگاہ اہل نظر میں جو ہو عمیق نظر

جو بزم اہل قیادت میں معتبر بھی ہو

کہاں سے لاؤ گے اب ایسا رہنما منصف

جو خوش بیاں بھی ہو خوش خو بھی خوش نظر بھی ہو

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی تحریکی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے۔ تحریک اسلامی کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں مقام بلند پر فائز فرمائے۔ آمین!

بقیہ: عظیم قائد: —

فرمایا خاص خاص مقامات جہاں اہل الرائے رفقاء رہتے تھے، دورہ کروایا اور ان حضرات سے میری کارروائی کی رپورٹ لے کر مجھے CONFIRM کیا۔ قیمتی کی ذمہ داری سنبھالنے میں مجھے سخت پس و پیش تھا تو کئی دن تک تسلی و دلاسہ دیتے رہے۔ ان تمام واقعات کا تعلق ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۳ء تک ہے۔ ان واقعات سے مرحوم کی ابتدائی دور کے طریقہ کار کا اندازہ ہوتا ہے۔ خدا مرحوم کی حسنات کو قبول فرمائے، کوتاہیوں سے درگذر فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)

بیتاب کاکوی

پیکر عزیمت

وہ صدائے جرس قافلہ منزل حق

راہرو جس سے رہا کرتا تھا سرگرم سفر

ہو گئی آہ اس آواز سے محروم فضا

قافلے والے اسے اور نہیں سن سکتے

جو ہمیشہ ہی رہا حق کے لیے سینہ سپر

جس سے ہر دم صف باطل میں پریشانی تھی

جس سے مانوس رہے طوق، سلاسل، زنداں

رزم گاہ حق و باطل کا مجاہد نہ رہا

جس کے انداز تکلم میں دلیل و برہان

جس کی تقریر میں عکاسی آہنگ خروش

جس کی تحریر میں سرمستی دریائے رواں

اب ہے خاموش زباں اور شکستہ ہے قلم

اٹھ گیا دریش کا جانباز امیر حلقہ

نام نامی جس کا تھا حامد حسین

جس نے بالآخر ادائے حج کے بعد

جان جان آفریں کو سونپ دی

جس کو راس آئی حرم کی سرزمیں

جنت المعالی میں وہ مدفون ہے

ایڈیٹر

سیّد صاحب کی اہلیہ محترمہ جواب دیتی ہیں

وہ انتہائی نفاست پسند، متقی اور پرہیزگار تھے

سوال:۔ پہلا سوال جو میرے ذہن میں آیا وہ یہ کہ آپ بتائیں کہ سید صاحب اور آپ کے تعلقات کیسے تھے؟ ازدواجی زندگی کی اس طویل مدت میں ماحول ہمیشہ خوشگوار ہی رہا یا کبھی ناچاقی بھی ہوئی؟

جواب:۔ یہ تو مجھے یقین ہے کہ میرے اس غم میں ساری اسلامی برادری برابر کی شریک ہے لیکن شدتِ غم سے میرے جو احساسات ہیں میں انھیں الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتی بہرحال آپ کے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ خدا کے شکر و احسان سے ہم دونوں کے ازدواجی تعلقات نہایت خوشگوار تھے اور کیوں نہ ہوتے وہ تو محبت کا سرچشمہ تھے البتہ کبھی کبھی چھوٹی موٹی باتوں بالخصوص بدسلیقگی (ان کی نظر میں معمولی سی بدنظمی بھی بدسلیقگی کے زمرے میں آتی تھی) پر وہ غصہ کرتے تھے جسے میں خاموشی سے سنتی تھی۔ اگر ان کا غصہ حد سے تجاوز کرنے لگتا تھا تب میں مدھم لہجے میں ہر بات کی وضاحت کرتی تھی جسے وہ غصہ کی حالت میں ہی سنتے تھے اور پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتے تھے اور جب اٹھتے تھے تو غصہ کافور ہو چکا ہوتا تھا۔ ویسے مجموعی طور سے ہماری ازدواجی زندگی قابلِ رشک تھی۔ وہ منھ پر تعریف کرنے کے قائل نہ تھے لیکن ان کی نظروں میں میری جو عزت اور وقعت تھی وہ مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کیونکہ اس کا اظہار اکثر وہ اعزا و اقارب اور دوست و احباب سے کیا کرتے تھے۔

سوال:۔ شادی کے بعد عورت کو سب سے پہلے جس چیز سے سابقہ پیش آتا ہے وہ شوہر

کا مزاج ہوتا ہے اور اس کی ترجیحات ہوتی ہیں اور عورت کو اس سے مطابقت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ آپ بتائیں کہ سید صاحب کا مزاج کیسا تھا؟ ان کی ترجیحات کیا تھیں اور آپ نے اس مرحلے کو کیونکر مکمل کیا؟

جواب:۔ سید صاحب کے مزاج سے میں بچپن سے ہی واقف تھی اور کیوں نہ ہوتی وہ میری سگی پھوپھی کے لاڈلے بیٹے تھے۔ انتہائی لاڈ پیار نے ہی ان کو بچپن میں خودسر بنا دیا تھا اور جو بات منھ سے نکل جائے اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ جہاں تک ان کے مزاج سے مطابقت کی بات ہے تو میری تربیت میری بڑی بہن اور دادی نے ایسی کی تھی کہ میں کسی کے مزاج کے خلاف کبھی کوئی کام نہیں کرتی تھی پھر سید صاحب تو میرے شریکِ حیات تھے اگرچہ میں بھی مزاج کی بہت تیز تھی لیکن شادی کے بعد سید صاحب کا مزاج دیکھ کر میں نے تیز مزاجی کو جو چھوڑا تو آج تک پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں نے ہمیشہ سید صاحب کی منشا کو اپنی مرضی و خواہش پر فوقیت دی، جیسا انھوں نے کہا بے چون و چرا مان لیا۔ کبھی کوئی ایسی فرمائش نہیں کی جسے بے جا کہا جائے اور سید صاحب کے مزاج اور خیالات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں مجھے بالکل دشواری نہیں ہوئی۔ میں ہمیشہ ان کی مرضی پر چلتی رہی جب تک وہ آزاد خیال رہے میں بھی ان کے شانہ بشانہ چلتی ہوئی آزاد خیال رہی اور جب انھوں نے توبہ کی اور تجدیدِ ایمانی کی تو میں بھی دین کی راہ پر چل پڑی۔ جہاں تک ان کی ترجیحات کا تعلق ہے تو صفائی اور سلیقہ اس میں سرِفہرست تھا۔

سوال:۔ آپ سید صاحب کی خوبیوں پر روشنی ڈالیں اس حیثیت سے کہ وہ آپ کے شوہر تھے؟

جواب:۔ ان میں جو خوبیاں تھیں وہ آپ حضرات سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ہاں بحیثیت شوہر ان کی خوبیاں ظاہر ہے کہ مجھے ہی معلوم ہوں گی۔ وہ انتہائی نرم دل، خوش گفتار اور شیریں کلام تھے۔ کسی کی تکلیف وہ برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ کوئی بچہ بیمار ہو جاتا تھا تو اس کے لیے اپنی رات کی نیند اور دن کا چین حرام کر لیتے تھے۔ ایک خوبی ان میں یہ تھی کہ اگر کوئی ہم کو برا بھلا کہہ دیتا تھا تو وہ صبر کی تلقین کیا کرتے تھے اور یہی طریقہ ان کا اپنا بھی تھا۔ مہمان نوازی کا جذبہ تو ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ کوئی بھی مہمان خواہ اس سے قرابت داری

مہمانوں کی آمد سے بڑے مسرور ہوتے تھے اور اگر رشتہ دار یا دوست احباب نہیں آتے تھے تو ان سے گلا کرتے تھے کہ میرے گھر کیوں نہیں آئے۔ حالانکہ میرا گھر سال کے تقریباً دس ماہ مستقل مہمان خانہ بنا رہتا ہے۔

سوال :- سید صاحب کی زندگی کے بیشتر ایام تو دوروں میں گذرتے تھے۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ سید صاحب گھر کے بچوں کی تربیت کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے؟

جواب :- خدا کا کرم ہے کہ سید صاحب اولاد کی طرف سے ہمیشہ مطمئن رہے۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کو غلط راہ سے بہت دور رکھا ہے۔ وہ کسی بھی معاملہ میں اولاد پر سختی کے قائل نہ تھے۔ ویسے بھی بچوں کی تربیت میں نے ہی کی ہے کیونکہ وہ زیادہ تر جماعتی پروگرام کے مطابق دوروں پر رہا کرتے تھے۔ انھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ڈال رکھی تھی اور کبھی اس معاملہ میں دخل اندازی نہیں کی۔ چونکہ بچوں پر والد کا ڈر طاری رہا کرتا تھا اس لیے وہ بالکل ہی بے فکر ہوگئے تھے۔ نہ بچے ان کی جماعتی مصروفیات میں مخل ہوئے اور نہ انھوں نے ہی بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف دھیان دیا۔ اس کے باوجود بحمد اللہ میرے تمام بچے بشمول داماد اپنے ابو جان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں البتہ جماعت میں باقاعدہ طور پر کوئی نہیں آیا ہے۔ لیکن اسلامی لٹریچر سے بہرحال ہر بچے کو دلچسپی ہے جس کا سب ہی اکثر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ فلموں اور فلمی دلچسپیوں سے کوسوں دور ہیں۔ حتیٰ کہ گھر میں ٹیلی ویژن کی موجودگی بھی گوارہ نہیں ہے۔ حالانکہ تمام بچے اپنے ابو جان کا وہ ویڈیو کیسٹ دیکھنے کے متمنی ہیں جو اورنگ آباد (مہاراشٹر) کے اجتماع میں بنا تھا لیکن ٹی وی کرایہ پر بھی لانا کسی بچے کو گوارہ نہیں ہے۔ کسی دوست کے گھر جا کر دیکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میرے بچے لیاقت حسین نے جو آج کل سعودی عرب کے کثیر الاشاعت اخبار "عرب نیوز" میں انٹرنیشنل ڈیسک کا ایڈیٹر ہے، مولانا مودودیؒ پر ایک کتاب لکھی ہے جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ دوسرے بیٹوں کا کہنا ہے کہ ابو جان نے کتابوں اور اپنی پاکیزہ و فی سبیل اللہ زندگی پر مشتمل جو گراں قدر اثاثہ چھوڑا ہے ہم اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے دین کی راہ میں ان کی کوششوں کو زندہ رکھیں گے انشاء اللہ۔ اور ان کے اس کام کو پورا کریں گے جو

وہ ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ اور ان کے اسلامی مشن کو آگے بڑھائیں گے۔ اس سے آپ میرے بچوں کی دین سے قربت اور اس سے قلبی لگاؤ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میرے بچوں نے عسرت کی زندگی بھی گذاری ہے اور اب خدا کے شکر سے خوشحالی کا دور بھی دیکھ رہے ہیں مگر ہر قسم کے اخراجات اپنی حدود میں رہ کر کرتے ہیں۔ تنگی کے دور میں بھی الحمد للہ میرا کوئی بیٹا ناجائز آمدنی کے حصول کی تگ و دو میں نہیں لگا۔ خدا کے شکر سے میں نے بچوں کی تربیت اس انداز سے کی ہے کہ آج بڑا بھائی چھوٹے بھائیوں پر نثار ہے تو چھوٹے بھائی بڑے بھائیوں پر نازاں۔ میری ہمیشہ یہ دعا رہتی ہے کہ یا اللہ اولاد کے لیے میری اس خدمت کو قبول فرمالے اور میرے بچوں کو دین و ایمان کی بیش بہا دولت سے مالا مال کر دے۔ آمین۔ ان کو راہِ مستقیم پر چلا اور مجاہدین فی سبیل اللہ بنا۔ ثم آمین۔

سوال :- سید صاحب نے تو اپنی پوری زندگی اللہ کے دین کو پھیلانے میں لگا دی۔ آخری ایام میں ڈاکٹروں کی سخت ہدایت کے باوجود اپنی بیماری کی پرواہ کیے بغیر تحریکی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ کیا انھوں نے بچوں کی بھی تربیت اس انداز سے کی ہے کہ ان کے اس روحانی ورثہ کو لے کر آگے بڑھ سکیں؟

جواب :- اس سوال کا جواب تو گذشتہ سوال کے جواب میں ہی شاید میں دے چکی ہوں۔ بہرحال اتنا مزید کہوں گی، میرا کوئی بچہ اقامتِ دین کے لیے جماعتِ اسلامی کی کوششوں سے نہ تو بیگانہ رہا ہے اور نہ ہی جماعت کے کاز کی کبھی مخالفت کی ہے اور نہ ہی جماعتی امور سے بے تعلق رہا ہے۔

سوال :- سید صاحبؒ اپنے گھر میں مجموعی حیثیت سے کیسے تھے؟

جواب :- اگرچہ آپ کے اس سوال سے متعلق بھی میں گذشتہ سوالات پر بہت کچھ کہہ چکی ہوں بہرکیف سید صاحب مجموعی حیثیت سے میرے اور اپنی اولاد کے لیے ایسے تھے کہ ہم میں سے کبھی کسی کو ان سے شکایت نہیں ہوئی۔ کبھی بیوی بچوں کی دل آزاری یا دل شکنی نہیں کی۔

سوال :- سید صاحب کے تقویٰ، طہارت، نظافت اور عادات و اطوار پر کچھ روشنی ڈالیں۔

جواب:- انتہائی نفاست پسند تھے۔ متقی اور پرہیزگار تھے۔ حقوق العباد کے ساتھ ساتھ بیوی، بچوں، رشتہ داروں اور ہمسایوں کے حقوق کا بھی بہت احترام کیا کرتے تھے۔ اگر قوام کی حیثیت سے وہ اپنے حقوق کا استعمال کرتے تھے تو ساتھ ہی اپنے فرائض سے بھی غافل نہیں تھے۔ طبیعت میں صفائی ستھرائی اور سلیقہ پن بے انتہا تھا۔ ہر بات اور ہر شے میں نظم کے قائل تھے۔ نفاست کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بے ڈھنگے انداز میں کوئی چیز ادھر اُدھر پڑی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سلیقہ کی حالت یہ تھی کہ اگر کوئی چیز اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہٹی ہوئی نظر آتی تھی تو سخت ناراض ہوتے تھے۔ ان کے اس سلیقہ پر ہی کبھی کبھی بچے دل ہی دل میں بہت جھنجھلاتے تھے۔ آرٹ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ گھر کی ہر شے آرٹ کا نمونہ تھی۔ بڑے صاف ستھرے ذوق کے مالک تھے۔ لباس کے استعمال میں بہت محتاط رہتے تھے۔ گرمیوں میں سر سے پیر تک سفید لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ لباس کے معاملہ میں یک رنگی کے قائل تھے۔ سردیوں میں جس رنگ کی شیروانی ہے تو پھر اسی رنگ کی ٹوپی، موزے، مفلر، دستانے غرض مناسبت سے ہر چیز ہوتی تھی۔

قدرتی مناظر سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ جس مقام پر بھی دورہ کے مقصد سے جاتے تفریحی پروگرام ضرور بناتے۔ شکار کا بہت شوق تھا۔ بہترین نشانہ باز تھے۔ بہت سے جانور مثلاً چیتل، ہرن، بارہ سنگھے اور پرندے مارے ہیں۔ جانوروں کی کھالیں کسی کو نہیں دیتے تھے۔ ایک بار اژدہا مارا تھا جس کی کھال کے سینڈل اور چپلیں بنوائی تھیں۔ ادھر دس بارہ سال سے شکار پر جانا بند کر دیا تھا۔

سوال:- سید صاحب کی زندگی تبلیغ اسلام کے لیے وقف تھی۔ وہ اکثر دوروں پر رہتے تھے اور آپ گھر پر بچوں میں تنہا۔ ایسے موقع پر آپ تحریک اسلامی، سید صاحب اور اپنے بارے میں کیا محسوس کرتی تھیں؟

جواب:- انھوں نے یقیناً اپنی زندگی اسلام کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ دورں پر رہیں گھر میں۔ تو بھائی وہ تھے چراغِ محفل اور میں ہوں چراغِ خانہ۔ چراغِ محفل اس نظریہ سے کہ وہ کثیر مجمع سے خطاب کرتے اور کونے کونے گھوم کر اسلام کی دعوت دیتے تھے

اور میں بچوں کی تربیت میں مگن تھی۔ لیکن میں نے قیدی کی سی زندگی بھی نہیں گذاری۔ سال میں ایک بار کبھی ہم دونوں، کبھی گھر کے تمام افراد اور کبھی ہم دونوں کے ساتھ کوئی پوتا یا پوتی ڈیڑھ دو ماہ کے لیے جنوبی ہند نکل جاتے تھے اور خوب گھوم پھر کر دلی واپس آتے تھے۔

سوال:- تحریک اسلامی پر ہندوستان میں کوئی بڑی آزمائش نہیں آئی (خدا اس سے محفوظ رکھے) البتہ ایسا ضرور ہوا کہ مرکزی لیڈرشپ جیلوں کے اندر چلی گئی۔ سید صاحب بھی کئی بار زنداں کے حوالے کیے گئے۔ اس وقت آپ کے احساسات کیا تھے، روشنی ڈالیں؟ اس خیال سے کبھی آپ کو پریشانی ہوئی کہ حکومت اس حد تک مہربان ہو جائے کہ سید صاحب کو تختۂ دار چومنا پڑے۔

جواب:- جب وہ جیل گئے ہیں تو میرے بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ صرف بڑا بچہ لیاقت سلمۂ ہی برسرِ روزگار تھا۔ سخت آزمائشی دور تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ مجھ پر یا کسی بچے پر برا اثر نہیں پڑا کیونکہ ہم سب اس سے واقف تھے کہ یہ جہاد ہے۔ ایمرجنسی کے دور میں ایک جانب سید صاحب داخلِ زنداں ہوئے اور دوسری طرف میں سخت بیمار پڑ گئی۔ لیاقت سلمۂ کو ایک اور آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ ہسپتال میں داخل ہوئی۔ آپریشن تجویز ہوا۔ اب لیاقت سلمۂ کو دفتر بھی جانا پڑتا تھا، ابو جان سے ملاقات کے لیے جیل بھی جانا پڑتا تھا۔ ہسپتال کے چکر بھی لگاتا تھا نیز گھر کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔ خدا کا شکر ہے اس کے پائے ثبات بالکل نہ ڈگمگائے۔ انتہائی صبر و شکر کا ہم سب نے مظاہرہ کیا۔ ایک ماہ کی سخت علالت کے بعد صحت یاب ہوئی۔ سات دن میرے بچوں نے میری دل و جان سے خدمت کی۔ دوسری طرف سلاخوں کے پیچھے میرے شوہر بے انتہا پریشان تھے سوائے دعاؤں کے کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔ خدا نے آزمائش کی یہ گھڑی بھی نکال دی۔ اگر خدانخواستہ یہ وقت بھی آتا کہ تختۂ دار پر چڑھنا پڑتا تب بھی شاید ہمارے قدم نہ ڈگمگاتے۔ سید صاحب کی گرفتاری کے بعد سی۔ آئی۔ ڈی کا افسر بھی آیا، مجھ سے تمام پوچھ تاچھ کی۔ میں اس وقت بھی مطمئن تھی۔ بچوں کو تسلی دلاسہ دے کر اپنی بھی تیاری کر لی کہ اگر یہ وقت مجھ پر بھی آیا تو ان شاء اللہ قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گی۔ سید صاحب کو میں نے خط لکھ دیا کہ کرم فرماؤں کی مجھ پر بھی نظرِ عنایت پڑنے کا امکان ہے اور میں بالکل

تیار ہوں۔

سوال :۔ سید صاحب کی زندگی کے کن کن پہلوؤں سے آپ متاثر ہوئیں؟ کوئی ایک واقعہ جس نے آپ پر گہرا اثر ڈالا ہو؟

جواب :۔ سید صاحب کی پاک وطاہر زندگی کے ہر پہلو سے میں بے انتہا متاثر تھی لیکن ایسا کوئی واقعہ ذہن میں نہیں آرہا ہے جس نے مجھ پر کوئی گہرا اثر ڈالا ہو۔

سوال :۔ ایک سوال بار بار میرے ذہن میں آرہا ہے اور میں اسے ٹھکرا رہی ہوں وہ یہ کہ شادی سے پہلے سید صاحب کی زندگی کیا تھی اور جس وقت آپ کا رشتہ سید صاحب سے جڑ رہا تھا اس وقت آپ کے احساسات کیا تھے؟ کیا آپ یہ محسوس کر رہی تھیں کہ سید صاحب سے رشتہ طے کرکے آپ کے والدین نے انصاف کیا ہے؟ یا کسی اور آئیڈیل شوہر کی خیالی تصویر آپ کے ذہن میں تھی۔؟

جواب :۔ شادی سے پہلے سید صاحب کی زندگی بالکل ایسی تھی جیسے کسی رئیس کا بگڑا ہوا بیٹا طالب علمی کی زندگی گذار رہا ہے۔ میرے والد سید صاحب کے حقیقی ماموں تھے وہ ایک سینما ہال کے جنرل منیجر تھے۔ چونکہ سید صاحب کالج کی تعطیلات ہمیشہ ہمارے یہاں آکر گذارتے تھے اس لیے روز کا مشغلہ فلم دیکھنا تھا۔ روزانہ شام کو بن ٹھن کر نئے نئے فیشن کے لباس میں ملبوس ہوکر چھڑی گھماتے ہوئے فلم دیکھنے جاتے اور لگاتار دو شو دیکھ کر اپنے ماموں کے ساتھ ہی رات گئے بگھی میں واپس آتے۔ ہم سب بہن بھائی بھی ان کو اور ان کی بذلہ سنجی کو بہت پسند کرتے تھے چونکہ وہ ہم لوگوں سے بہت قریب تھے اس لیے میں ان کی ہر عادت سے بخوبی واقف تھی۔ جب سید صاحب نے میرے لیے اپنا عندیہ ظاہر کیا تو ہمارے گھر کے سب لوگ راضی تھے لیکن میرے بڑے بھائی مرحوم جو مجھے بے انتہا چاہتے تھے اس رشتہ پر ہرگز راضی نہیں تھے کیونکہ وہ سید صاحب کی فیشن پرستی اور آزاد خیالی سے بہت نالاں تھے اور انھیں فرنگی ذہنیت کا کہتے تھے لیکن سب کے بے انتہا اصرار پر بالآخر بادل نخواستہ وہ راضی ہوگئے۔ اس طرح میں ان کی زندگی میں داخل ہوگئی اور بعد میں مجھے اور اس رشتہ کی مخالفت کرنے والے میرے بھائی کو احساس ہوگیا کہ ابا جان نے ناانصافی نہیں کی ہے۔ وہ واقعی ایک آئیڈیل شوہر ثابت ہوئے۔

سوال :۔ سید صاحب اور اپنے خاندان پر کچھ روشنی ڈالیں؟

جواب :۔ سید صاحب کے خاندان والوں کو نسلی غرور بہت تھا۔ بگڑے ہوئے زمینداروں پر مشتمل یہ خاندان تھا۔ سید صاحب کے پردادا عرب سے آئے تھے، ان کا خاندان خطیب خاندان ہے۔ سید صاحب کے بزرگوں کو نظام حیدرآباد سے خلعت اور اراضی ملی ہوئی تھی۔ وہی خلعت پہن کر آج تک آبائی مسجد میں ہر عید بقرعید کے دن خاندان کا بزرگ خطبہ دیتا ہے۔ سید صاحب اپنے خاندان والوں کے نسلی غرور اور دولت کے گھمنڈ سے بہت نالاں تھے اس لیے انھوں نے اپنے دو بیٹوں کی شادیاں غیر سید برادری میں کرکے خاندان والوں کو حیرت زدہ کردیا کیونکہ خاندان میں غیر برادری کی کوئی لڑکی نہ لائی جاتی تھی اور نہ لڑکی دی جاتی ہے۔ سید صاحب کے خاندان میں، بلکہ خود میرے خاندان میں بھی بدعت بہت زیادہ تھی۔ ہم دونوں ہی اپنے خاندانوں میں فاتحہ ونذر ونیاز کی چیزیں نہیں کھاتے تھے اور نہ ہی کبھی اپنے بچوں کو کھانے دیا چونکہ خاندان کے بزرگوں پر بھی سید صاحب کا رعب طاری رہتا تھا اس لیے کوئی برا بھی نہیں مانتا تھا۔ میرا خاندان بخاری ہے، میرے پردادا بخارا سے آئے تھے۔

سوال :۔ آئندہ آپ کا پروگرام کیا ہوگا؟ کیا سید صاحب کے مشن کو عورتوں میں آپ جاری رکھیں گی؟

جواب :۔ اگر صحت نے اجازت دی اور زندگی باقی رہی تو انشاء اللہ جماعتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہوں گی اور اقامت دین کے لیے اپنی حقیر کوششیں جاری رکھوں گی۔

سوال :۔ سید صاحب کے آخری سفر کے بارے میں کچھ بتائیں۔ جس وقت آپ نے یہ خبر سنی آپ کے احساسات کیا تھے؟

جواب :۔ حج کو جاتے وقت جہاں سید صاحب بہت مسرور تھے وہیں اپنی واپسی سے مایوس بھی تھے جبکہ مجھے یقین تھا کہ وہ واپس آئیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کو وہ اتنا بھاگئے کہ اللہ نے ان کو وہیں رکھ لیا۔ خبر سننے کے بعد کے احساسات کیا تھے یہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ یہ میرے بس سے باہر ہے۔

سوال :۔ حیات نو کے قارئین کے لیے آپ کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟ (بقیہ صفحہ پر)

مولانا مقبول احمد فلاحی

سماج سدھار کیمپ

مولانا سید حامد حسین صاحب مرحوم کی خصوصی پیشکش

> مولانا مقبول احمد فلاحی جماعت اسلامی ہند علاقہ بریلی کے ناظم ہیں۔ آپ کو ایک عرصہ تک مولانا سید حامد حسینؒ کے ساتھ رہنے اور قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ مولاناؒ کے اندر رفقاء کی ہمہ گیر تربیت، جماعت اسلامی کے تعارف اور ملت کے مسائل کو حل کرنے کے لیے جو انتھک جدوجہد، تڑپ اور بے چینی پائی جاتی تھی یہ خاکہ اس کی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔

جماعت اسلامی ہند اپنے دستور کی روشنی میں چار سالہ میقات کے لیے ایک پالیسی مرتب کرتی ہے اور اس پالیسی پر عمل درآمد کے لیے ایک جامع پروگرام دیتی ہے۔ چونکہ تحریک اسلامی اسلام کے مکمل اور بہترین نظام حیات ہونے پر یقین رکھتی ہے اور اس کے نزدیک انسانی سماج کے پیچیدہ مسائل کا اسلام ہی واحد حل ہے۔ اس لیے اس کی پالیسی اور پروگرام کا دائرہ محدود اور یک طرفہ نہیں ہو سکتا۔ وہ جہاں ایک طرف قرآن و سنت کے واضح احکامات کی رو سے غیر مسلمین میں اسلامی تعلیمات کے فروغ اور اس کے بنیادی عقائد کی دعوت کا کام انجام دے گی وہیں مسلم ملت کی اصلاح و تربیت اور فکری و عملی رہنمائی بھی اس کی ذمہ داری قرار پائے گی۔

تحریکِ اسلامی جیسی انقلابی تحریک کے لیے یہ بھی ضروری قرار پاتا ہے کہ جو چیزیں غلط

اور باطل ہیں اس پر کھل کر مدلل انداز سے تنقید کرے اور جو افکار و نظریات خلاف فطرت، انسانیت کش اور باطل ہیں ان کو لوگوں کے دل و دماغ سے کھرچنے کی بھی جدوجہد کرے۔

مزید برآں دورِ نبویؐ کے بعد جب بھی اس طرح کی کوئی تحریک اٹھے گی اسے لازماً ایک ایسی ملت سے سابقہ پیش آئے گا جو اسلام کا نام لیتی ہوگی خواہ بگڑی ہوئی صورت میں ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ملت جہاں کہیں بھی ہوگی اس کے کچھ مخصوص مسائل ہوں گے۔ بالخصوص ہندوستان جیسے غیر مسلم اکثریتی ملک میں کچھ الجھنوں کا ہونا، کچھ رکاوٹوں اور مزاحمتوں کا پایا جانا ناگزیر ہوگا۔ ملتِ اسلامیہ کے ان مسائل کے حل میں تحریک کو حصہ لینا پڑے گا۔ ورنہ اس سے صرف نظر سے اس بات کا عین امکان پیدا ہو سکتا ہے کہ تحریک کو اپنے کاز کے لیے جو پہلے سے خام مواد میسر ہے اس سے اپنے آپ کو محروم کرے اور یہ کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہوگی۔

پھر تحریکِ اسلامی کے سامنے اس ملک کے کچھ مسائل ہوں گے جہاں وہ چل رہی ہے۔ اس سے بھی چار و ناچار اسے تعرض کرنا پڑے گا کیونکہ اسلام کی روشنی اس دنیا ہی کے لیے ہے۔ اس کے برکات سے دنیا ہی کو مستفید ہونا ہے۔ ظاہر ہے جس ملک میں تحریک چل رہی ہے وہ اولین مستحق ہے کہ اسلامی تعلیمات سے فائدہ اٹھائے۔ پھر پوری دنیا اور پوری عالم انسانیت اس کے برکات اور فوائد کی مستحق قرار پاتی ہے۔ لہٰذا تحریکِ اسلامی کو ملک اور عالم انسانیت کے مسائل سے بحث کرنا پڑے گا۔ اور حتی المقدور ہر سطح پر اسلامی اصول و تعلیمات سے لوگوں کو روشناس کرانا ہوگا۔

ٹھیک اس وقت جبکہ فکری، علمی، روحانی اور اصولی طور پر اسلام کی حقانیت کی دعوت کا کام انجام دیا جا رہا ہوگا، یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ مادی اور عملی اعتبار سے بھی انسانیت کو راحت پہنچانے کا کام انجام دیا جائے۔ یہ کام ایک طرف دین کا تقاضا قرار پاتا ہے۔ دوسری طرف تحریک کی مقبولیت اور اس کے فروغ و نفوذ کی راہیں بھی اس سے نکلتی ہیں اس لیے "خدمت خلق" کے عنوان سے بعض پروگرام بنانے پڑتے ہیں۔

یہ سارے کام انجام دیتے ہوئے اگر داخلی استحکام، نظم و ضبط اور تحفظ و بقا پر توجہ نہ دی جائے اور جو لوگ اس سے وابستہ ہیں ان کی فکری، علمی اور عملی تربیت کا کام نہ کیا جائے

تو عین ممکن ہے کہ فضاؤں میں بلند کی جانے والی عمارت اپنی بنیادوں اور اجزائے ترکیبی کے ناقص ہونے کی وجہ سے زمین بوس ہو جائے۔ لہٰذا تحریکِ اسلامی کو خارجی فروغ و اشاعت کے ساتھ داخلی استحکام پر خصوصی توجہ صرف کرنی پڑتی ہے اور اپنے کارکنوں کی تربیت و تنظیم کے لیے پروگرام بنانا پڑتا ہے۔

ان کے علاوہ بدلتے ہوئے حالات و مقامات میں تحریکِ اسلامی کے سامنے اور بھی کام توجہ کے مستحق قرار پا سکتے ہیں۔ سردست تحریکِ اسلامی ہند کے پیشِ نظر مذکورہ بالا کام ہی ہیں جنھیں اچھے انداز سے روبہ کار لانا اور ان عنوانات کے تحت پروگرام تیار کرکے اس کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد کرنا اس پر لازم آتا ہے۔

ایک پالیسی وضع کر لینا اور اس کی روشنی میں منصوبہ بند طریقے سے پروگرام بنا لینا اور بات ہے اور اس پروگرام میں جان ڈالنا، اس کو قابلِ عمل اور پُرکشش بنا دینا اور اس سے لوگوں کی دلچسپیاں وابستہ کر دینا ایک دوسری بات ہے۔ مختلف ادارے اور تنظیمیں نہایت خوبصورت اور اچھے اچھے پروگرام بناتی ہیں، مگر اس میں انسانی فطرت سے ہم آہنگی، تنوع اور خود کاری کی کمی کی وجہ سے چند روز نہایت آب و تاب سے چلنے کے بعد فیل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا تحریکِ اسلامی کے لیے بھی ایک اہم سوال ہے کہ یہ پالیسی پروگرام بنا لینے کے بعد اسے کیونکر مؤثر، قابلِ عمل اور عوام کے لیے پُرکشش بنایا جائے۔

یہ بات عام طور پر سننی جاتی ہے کہ تحریکِ اسلامی عوام میں نفوذ کی راہیں تلاش کرنے میں ناکام ہے۔ ملک کا ایک مخصوص، باشعور اور تعلیم یافتہ طبقہ ہی اس کو سمجھتا اور کسی قدر اس میں حصہ لیتا ہے۔ باقی عوام کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ بات کسی قدر درست بھی ہے۔۔۔۔ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے تحریکِ اسلامی کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ عوام میں اس کی کوئی آواز نہیں ہے۔ یہ سمجھنا کہ صرف خواص کو متعارف کرا کے مطلوبہ انقلاب لایا جا سکتا ہے، یہ بھی درست نہیں ہے۔ انقلاب تک پہنچنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ تحریک کو عوام کی توجہ کا مرکز بنایا جائے۔ عوام الناس اس کے عزائم اور مقاصد کو سمجھ کر اس کے پروگراموں میں حصہ لینے لگیں۔ مگر عوامی نفسیات کو سمجھ کر تحریک کے مزاج کو ان تک منتقل کرنے کے لیے ایسا خاکہ تیار

کرنا جس میں تحریک کے وقار، اس کی روح اور بنیادی فکر پر کوئی اثر نہ آئے۔ یہ ایک عظیم کام ہے۔ ممکن ہے یہ نکتہ قائدین کی سوچ کا مرکز ہو مگر عملی طور پر اب تک کوئی نمایاں کامیابی نہیں مل سکی ہے۔

اس کے علاوہ جب کوئی تحریک طول پکڑتی ہے تو اس کے سامنے ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ طویل المدتی منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تحریک کو تحریک کیونکر برقرار رکھا جائے۔ دنیا میں آئے دن مختلف مقاصد کے تحت تحریکیں اٹھتی ہیں اور کبھی مقصد حاصل کرکے اور عموماً ناکام ہو کر ختم ہو جاتی ہیں۔ تحریکِ اسلامی اپنی تمام تر معقولیت اور حق پسندی کے باوجود اگر اس کی تحریکیت ختم ہو گئی تو دیگر اداروں اور جماعتوں کی طرح یہ بھی ایک جماعت کی شکل اختیار کرکے داستانِ عبرت بن کر رہ جائے گی۔

ظاہر ہے یہ اہم سوال قائدین کی توجہ کا مرکز ضرور ہوگا۔ اور بہت سے پروگرام اس کا عملی مظہر بھی ہیں لیکن تاہنوز ایسے کسی پروگرام کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے جو تحریک کے مزاج سے مطابقت رکھنے والا اور حصولِ مقصد میں نہ صرف معاون بلکہ حد درجہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہو۔ جب تحریکوں کے لیے صحیح، مثبت، معتدل اور ولولہ انگیز راستہ نہیں مل پاتا تو مخلص کارکن اور سوجھ بوجھ رکھنے والے قائدین کے باوجود بسا اوقات ایسے راستے پر جا پڑتی ہیں جس کا اوّل دن تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تحریکِ اسلامی کی پالیسی، اس کے پروگرام اور اس راہ کی رکاوٹوں اور مشکلات نیز چند بنیادی سوالات کی روشنی میں اس وقت ایک ایسے پروگرام کا تعارف کرانا پیشِ نظر ہے جو بیک وقت کافی حد تک ان سب موضوعات پر حاوی ہے۔

جناب مولانا سید حامد حسین مرحوم جب اپریل ۸۲ء میں بحیثیت امیر حلقہ اترپردیش لکھنؤ تشریف لائے تو انھوں نے دیگر دعوتی، تنظیمی، تربیتی امور کی انجام دہی کے ساتھ ایک ایسا پروگرام دیا جو تمام امور پر حاوی تھا۔ اسے مولانا نے "سماج سدھار کیمپ" کا نام دیا۔ اخبارات اور رپورٹوں کے ذریعے کسی قدر اس کا تعارف ہو چکا ہے۔ لیکن بعض اعتراضات کو رفع کرنے اور صحیح صورت کو آشکارا کرنے کے لیے کیمپ کا مزید تعارف کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

کیمپ کا تعارف

میں نے نہایت قریب سے اس پروگرام کا جائزہ لیا ہے۔ عملی حصہ بھی لیا ہے۔ اس کے مفید اور مضر پہلوؤں پر غور کیا ہے۔

سماج سدھار کیمپ کا جو نقشہ میرے ذہن میں موجود ہے اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سماج سدھار کیمپ کے انعقاد کے لیے عموماً ۳، ۵ اور ۷ دن مقرر کیے جاتے تھے۔ اس کے لیے ایسے مقام کا انتخاب کیا جاتا جو جماعتی اصطلاح کے تحت "منتخب بستی" میں شمار کیا جاتا تھا۔ تاریخوں کے اعلان کے بعد باہر کے کارکنوں کے علاوہ متعلقہ ضلع کے تمام ارکان اور کارکنوں کی شرکت کم از کم چوبیس گھنٹے کے لیے لازم قرار دی جاتی۔ اس کے بعد جو لوگ رکنا چاہتے وہ پورے پروگرام میں شریک ہوتے اور جانے والوں کو آزادی ہوتی۔ ابتدائی چوبیس گھنٹوں میں کیمپ کے مقاصد، کام کے طریقوں، متعلقہ مقام کے سروے اور دیگر ابتدائی معلومات پر روشنی ڈالی جاتی۔

کیمپ کے انعقاد سے قبل پوسٹرس، اعلانات اور ہینڈبلز کے ذریعہ اس کا تعارف کرایا جاتا۔ اور مختلف شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کو اپنے اپنے شعبے کے تحت عملی دلچسپی لینے اور تعاون کرنے پر آمادہ کیا جاتا۔

کیمپ کے دوران بحیثیت مجموعی جو کام کیا جاتا وہ سحرخیزی، تذکیری پروگرام، اور شب میں کوئی دعوتی پروگرام۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا کہ قبل نماز فجر کارکن کئی ٹکڑیوں میں بٹ کر پورے قصبے میں پھیل جاتے۔ "الصلوٰۃ خیر من النوم" کہہ کر لوگوں کو نماز کے لیے بیدار کرتے۔ متعارفین کی کنڈیاں کھٹکھٹاتے۔ جن سے ملاقات ہوتی انھیں وقت پر مسجد پہنچنے پر آمادہ کرتے۔ پھر اپنے اپنے علاقوں کی مساجد میں نماز ادا کرتے۔ بعد نماز فجر اس وفد کا ایک باصلاحیت کارکن قرآن یا حدیث کا درس دیتا۔ واپسی پر لوگ کیمپ میں آکر ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوتے پھر اپنے اپنے شعبے کے تحت مفوضہ ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مصروف ہو جاتے۔ بعد نماز مغرب ایک مختصر نشست ہوتی جس میں مختلف شعبہ جات کے ذمہ داران اپنی اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتے۔ بعد نماز عشاء عوامی دعوتی پروگرام ہوتا۔ عموماً کیمپ کے دوران جو شعبے کام کرتے ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

۱۔ شعبہ طب و صحت | اس شعبہ کے ذمہ قصبہ کی عمومی صحت کے بارے میں معلومات فراہم کرنا، بیماروں کا سروے کر کے علاج کی عملی تدابیر اختیار کرنا، مقامی ڈاکٹروں اور حکیموں سے ربط پیدا کرنا، طب و صحت کے مسائل پر اطباء کی نشست کرنا، عوام کا اجتماع منعقد کر کے حفظانِ صحت کے اصول بتانا اور مفید مشورے دینا۔ آئندہ مستقل طور پر فری ڈسپنسری قائم کرنے کی کوشش کرنا، حفظانِ صحت پر ایک ہینڈبل شائع کرا کے تقسیم کرانا۔ اس کے علاوہ جہاں کیمپ میں آنے والوں کا علاج کیا جاتا وہیں حکمت کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام بھی انجام دیا جاتا۔

۲۔ شعبہ عدل و انصاف | اس شعبہ کا نام کہیں "اصلاح ذات البین" اور کہیں "شرعی عدالت" رکھا جاتا۔ اس شعبہ میں چند تجربہ کار تعلیم یافتہ اور شریعت و قانون سے واقفیت رکھنے والے افراد متعین کیے جاتے۔ یہ شعبہ قصبہ کے نزاعی معاملات کو سمجھتا، لوگوں کو کیمپ میں قائم شرعی عدالتوں سے رجوع کرنے کی دعوت دیتا۔ جو مقدمات فریقین کی رضا سے کیمپ کے سپرد کیے جاتے انھیں خوش اسلوبی سے طے کر کے سچے اور سستے انصاف کا نمونہ پیش کیا جاتا۔ موجودہ عدالتوں سے بیزار انصاف پسند حضرات کیمپ سے ربط قائم کر کے اپنے اپنے معاملات کا فیصلہ کراتے۔ اطلاع کے مطابق ان شرعی عدالتوں کے ذریعہ بہت بہت پرانے اور پیچیدہ مقدمات کے فیصلے کیے گئے اور عوام میں نہایت اچھا اثر قائم ہوا ہے۔

۳۔ زراعت | تیسرا شعبہ زراعت اور کھیتی باڑی کا ہوتا۔ فن زراعت سے واقف کار بیرونی اور مقامی افراد اس شعبہ میں شامل کیے جاتے۔ ان کا کام زراعت پیشہ لوگوں کے حالات و مسائل کو سمجھنا، کسانوں کا اجتماع منعقد کر کے بعض ضروری اور مفید معلومات فراہم کرنا، ان کے حالات سدھارنے کے عملی تجاویز اور مشورے دینا۔ قصبہ میں بلاسودی قرض سوسائٹی اور بیج گودام قائم کرنے کی کوشش کرنا ہوتا۔

۴۔ صفائی ستھرائی | چوتھا شعبہ صفائی ستھرائی کا قائم کیا جاتا۔ اس شعبہ کے تحت اہلِ عزم و ہمت افراد پر مشتمل ایک ٹیم قصبے کی صفائی ستھرائی کا جائزہ لیتی۔ اس کام میں سرکاری عملے اور اہل قصبہ سے تعاون حاصل کرتی۔ عملاً کچھ نالیوں، گلیوں، سڑکوں، کنوؤں اور عبادت گاہوں کی صفائی کا نظم کرتی۔ لوگوں کو صفائی ستھرائی اور حفظانِ صحت کے اصول بتاتی۔ حسب ضرورت عوام کے

اجتماع سے بھی اس موضوع پر گفتگو کی جاتی۔

یہ شعبہ اپنی کارکردگی میں نمایاں رول اس وقت ادا کرتا جب ایک ٹیم باقاعدہ جھاڑو، پھاوڑے، جوتے اور بلیچنگ پاؤڈر کے ساتھ صفائی میں مصروف ہوتی اور قافلے کے ساتھ ایک ٹھیلے پر نصب لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ ایک شخص بروقت موثر پیرائے میں لوگوں کو صفائی ستھرائی کی اہمیت بتاتا جاتا۔ اور آئندہ مستقل طور پر صفائی کے اہتمام پر لوگوں کو اکساتا جاتا۔ صفائی کے تذکرہ میں، سماجی گندگی، سیاسی گندگی، فکر وعقیدے کی گندگی، معاشی گندگی اور تمام غلاظتوں سے صفائی پر گفتگو ہو جاتی۔ یہ پروگرام دعوتی اعتبار سے بڑا موثر اور مفید ثابت ہوتا۔

۵۔ تعلیم وتدریس پانچواں شعبہ تعلیم وتدریس کا ہوتا۔ اس شعبہ میں اساتذہ اور ماسٹر صاحبان ہوتے۔ یہ لوگ گھوم پھر کر قصبے کے مدارس اور اسکولوں کا تعلیمی جائزہ لیتے۔ اساتذہ کی نشست منعقد کرکے بعض ضروری اور اصولی امور پر تبادلہ خیال کرتے۔ ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے۔ نصاب تعلیم اور طریقہ تعلیم پر گفتگو کرتے۔ تعلیم کے موضوع پر فولڈرس تقسیم کرتے۔ آئندہ کے لیے تعلیم بالغان کا نظم قائم کرنے کی جدوجہد کرتے۔ لوگوں کو بچوں کی اسلامی تعلیم وتربیت پر آمادہ کرتے۔ اگر کہیں دینی درسگاہ نہ ہوتی تو وہاں عوام کو اس کی اہمیت بتا کر قیام پر اکساتے۔ بچوں کی ہمت افزائی کے لیے معمولی انعامات کی تقسیم کا بندوبست کرتے۔

۶۔ اخوت ومساوات چھٹا شعبہ اخوت ومساوات کا ہوتا جسے دوسرے لفظوں میں اخوت، مساوات اور بھائی چارے کا شعبہ کہا جاتا۔ باہر سے آئے ہوئے اور مقامی افراد مل کر قصبے کی ہر ذات اور برادری کی ایک نشست منعقد کرتے۔ چھوت چھات اور اونچ نیچ کے خلاف اظہار خیال کیا جاتا۔ اس موضوع پر کتابچے تقسیم ہوتے۔ عملاً ایک ہی دسترخوان پر چائے نوشی کے ذریعہ اخوت ومساوات کا ثبوت دیتے۔

۷۔ دعوت ونشر واشاعت ساتواں شعبہ دعوت اور نشر واشاعت کا قائم کیا جاتا۔ یہ شعبہ کیمپ کے تعارف کے لیے پوسٹرس اور ہینڈ بلس تیار کرتا۔ کیمپ کے دوران مختلف شعبوں میں کام آنے والے فولڈرس شائع کرتا۔ کیمپ کے دوران لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے مختلف اوقات میں ہونے والے پروگراموں کا تعارف کراتا۔ لوگوں کو کیمپ سے تعاون اور استفادہ پر آمادہ کرتا۔ ایام کیمپ

میں ہر روز مشترکہ طور پر بعد نماز عشاء کوئی نہ کوئی دعوتی پروگرام منعقد کرنا۔ مثلاً کسی روز سماج سدھار پر سمپوزیم، کسی روز ذمہ داروں کے خطاب عام، کسی روز اصلاحی ویڈیو کیسٹ کی نمائش، کسی روز ادب اسلامی کی نشست وغیرہ۔ دن بھر کے عملی پروگراموں کی وجہ سے لوگ شب کے پروگرام میں کافی تعداد میں امنڈ آتے اور اس کے ذریعہ اپنی دعوت آسانی سے پہنچا دی جاتی۔

حسب ضرورت ان شعبوں کے علاوہ بعض بعض مقامات پر خواتین کا ایک الگ شعبہ قائم کیا جاتا۔ باہر سے کارکن خواتین کو مدعو کرکے قصبے میں مختلف انداز کے پروگرام چلائے جاتے۔ کہیں نوجوانوں کا الگ شعبہ قائم کیا جاتا۔ اس کے ذریعہ نوجوانوں میں نفوذ کے راستے نکالے جاتے۔ ان سے ربط پیدا کیا جاتا۔ نوجوانوں کی تنظیم کا تعارف کرایا جاتا اور کوشش کی جاتی کہ متعلقہ مقام پر نوجوانوں کی سرکل قائم ہو جائے۔

یہ مختلف شعبے صبح سے شام تک اپنے متعلقہ کاموں کی انجام دہی میں مصروف رہتے۔ ان کاموں کی انجام دہی کے طریقہ کار میں مقامات کے حالات کا لحاظ کرکے کہیں کہیں جزوی طور پر فرق بھی کیا جاتا۔ مثلاً جہاں افرادی قوت کم ہوتی وہاں تمام شرکاء کے اشتراک وتعاون سے مذکورہ امور انجام دیے جاتے۔ رات میں جائزہ نشست ہوتی جس میں دن بھر کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی جاتی اور ذمہ داروں کی طرف سے مفید مشورے دیے جاتے۔ کہیں پروگراموں کے دوران وقفوں میں چائے خانوں اور ہوٹلوں میں دعوتی غرض کے لیے بیٹھنے کا پروگرام بنایا جاتا۔ وہاں عوام الناس کی نفسیات کو سمجھ کر دعوتی گفتگو کی جاتی۔ اس میں دعوتی کام کی انجام دہی کے لیے شرکاء کی تربیت بھی پیش نظر ہوتی۔

کیمپ کے مثبت اثرات سماج سدھار کیمپ کی اس تفصیل سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کیمپ کے ذریعہ بیک وقت نہایت موثر انداز سے دعوت، اصلاح معاشرہ، خدمت خلق، باطل افکار ونظریات پر تنقید، ملکی اور ملی مسائل اور تربیت وتنظیم کا کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ غیر مسلم ہوں یا مسلم عوام، پسماندہ طبقات کے لوگ ہوں یا قصبے کے سربرآوردہ لوگ، خواتین ہوں یا بچے، چونکہ بیشتر پروگرام عملی ہوتے ہیں اور تمام لوگ بچشم سر انہیں دیکھتے ہیں ساتھ ہی اس کی تشریح اور اسلام میں ان کاموں کی اہمیت بتائی

جاتی ہے لہٰذا بڑی آسانی سے ہر ذہنی سطح کے لوگ تحریک اور اسلام کو سمجھ لیتے ہیں اور یہ اتنا زبردست کام ہے جو محض تقریروں اور خطابات عام کے ذریعہ ہرگز حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ گنجائش نہیں ہے ورنہ سماج سدھار کیمپوں کی اثر انگیزی اور عوام کی دلچسپی اور پسندیدگی کا واقعات کی روشنی میں جائزہ لیا جاتا تو اور بھی بات وضاحت کے ساتھ سامنے آسکتی۔ اس نئے پروگرام سے تھوڑی بہت جو جھجک محسوس ہوتی ہے وہ بھی رفع ہو جاتی۔ گویا بیک وقت پالیسی کے تمام اجزا پر تنہا یہ پروگرام احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اس کے علاوہ پروگراموں میں جاذبیت اور تنوع پیدا کرنے کا سوال بھی اس کیمپ سے بہت کچھ حل ہو جاتا ہے۔ جماعت کی بنیادی پالیسی کی روح کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے اندر ایک جدت، کشش، تنوع اور ہمہ گیریت نظر آتی ہے۔

پھر بھی اس سوال کا بھی یہ پروگرام بہترین جواب ہے کہ تحریک اسلامی کو مقبول عام کیسے بنایا جائے اور تحریک اسلامی کے تعارف کا کونسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جماعت کا وقار بھی مجروح نہ ہو اور آسانی سے ہر سطح کے لوگ بڑی تعداد میں اس کو سمجھنے لگیں۔ کسی تحریک کی طرف لوگوں کی رغبت اور عوام میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی اس کی تحریکیت کو برقرار رکھنے اور مزید نکھار پیدا کرنے میں بہترین رول ادا کرتی ہے۔

بعض سوالات کے جوابات

اس کیمپ کی تفصیلات اور رپورٹ دیکھنے کے بعد بعض لوگوں کے ذہن میں کچھ سوالات پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ ایک اعتراض تو یہ کیا جاتا ہے کہ یہ پروگرام محض نمائشی اور دکھاوے کا ہے اور تحریک اسلامی جو ہر کام خالصۃً للہ کرتی ہے اس کے مزاج سے متصادم ہے۔ میرا خیال ہے یہ اعتراض کسی گہری سوچ کا نتیجہ نہیں ہے۔ ذرا غور کیجیے تحریک اسلامی اپنے سامنے بہت سے عوامی پروگرام رکھتی ہے۔ اس زاویہ نظر کو درست مان لیا جائے تو یہ اجتماعات، یہ رپورٹیں، یہ فلاحی ادارے، یہ تعلیم گاہیں، یہ صنعتی ادارے، یہ ریلیف ورک، یہ فری ڈسپنسریاں سب کی سب نمائشی قرار پا جائیں گی۔ آخر یہی اعتراض تحریک کے مخالفین بھی تو کرتے ہیں وہ بھی ان کاموں کو نمائشی اور سستی شہرت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

دراصل تمام امور کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اخلاص نیت کے ساتھ فروغ دعوت اور تعارف مقصد کے لیے ان پروگراموں پر مذکورہ بالا الزام بے معنی ہے۔ دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ یہ وہی طریقہ کار ہے جسے عیسائی مشنریاں اختیار کرتی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کونسی عیسائی مشنری نماز کے لیے بیدار کرتی، درس قرآن کا نظم قائم کرتی، غیر سودی قرض سوسائٹی قائم کرتی، اسلامی تعلیم کی طرف راغب کراتی، شرعی عدالتیں وغیرہ قائم کرتی ہے۔

پھر اگر بفرض محال تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس میں قباحت کیا ہے۔ حصول مقصد کے لیے اگر ہمارا طریقہ ان کے طریقوں سے کسی مرحلے میں مماثل ہو جاتا ہے تو مقصدیت میں یا اس طریقے میں کراہت کا کونسا پہلو آگیا۔ دراصل کوئی بات کہنی ہو تو متعین صورت میں کسی پروگرام پر ناقدانہ نظر ڈالنی چاہیے اور گن گن کر اس کی قباحتیں واضح کرنی چاہئیں تاکہ سمجھا جاسکے کہاں اور کس وجہ سے سماج سدھار کیمپ میں قباحت ہے۔ بغیر دلیل کے کوئی دعویٰ معتبر تو ہو نہیں سکتا۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کیمپ کا انعقاد وقتی اور عارضی پروگرام ہے اور اس نوعیت کے پروگرام غیر فطری ہوتے ہیں جبکہ تحریک اسلامی کو اپنے پروگرام فطری انداز سے چلانے چاہئیں۔ مثلاً وقتی طور پر دوائیں تقسیم کر دینا، صفائی کر دینا اور پھر بعد میں اس جانب کوئی توجہ نہ دینا خلاف فطرت ہے۔

پہلے تو اس غلط فہمی کو دور ہونا چاہیے کہ مستقل طور پر کوئی کام کرنے کی جدوجہد نہیں کی جاتی۔ ابھی کیمپ کے تعارف میں وضاحت کے ساتھ یہ بات آچکی ہے کہ ہر شعبہ اپنے طور پر وقتی کاموں کی ادائگی کے ساتھ اپنے پیچھے مستقل طور پر یہ پروگرام دینے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً فری ڈسپنسری کا قیام، بلاسودی قرض سوسائٹی کی بنا، نماز کی طرف عمومی میلان، شرعی عدالتوں کا قیام وغیرہ۔ پھر یہ بات بھی آچکی ہے کہ ان کیمپوں کا انعقاد ایسے مقامات پر کیا جاتا ہے جو پہلے سے ہماری مخصوص اصطلاح میں "منتخب بستی" کے زمرے میں آتے ہیں۔ کیا اس پس منظر میں یہ سوچنا درست ہے کہ بعد میں اس کا خیال نہیں رکھا جاتا ہوگا یا کیمپ کے اثرات کو سمیٹنے اور قائم شدہ اداروں کی نگرانی سے قطعی صرف نظر کر لیا جاتا ہوگا۔

ایک بات اور کہی جاتی ہے کہ کیمپ کے بعض پروگرام بالخصوص "صفائی ستھرائی" سے

رفتار کی عزتِ نفس اور خودی کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ میں اس اعتراض پر گفتگو کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔ عام قاری اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس بات میں کتنا وزن ہے۔ خودی یا عزتِ نفس کی کیا تشریح ہے۔ اور حصولِ مقصد کے راستے میں اس کی کس حد تک رعایت کی جانی چاہیے وغیرہ۔ آخر میں تربیتی نقطۂ نظر سے ایک قابلِ ذکر بات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مختلف شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کو ان کے میدانِ کار میں دعوتی کام کیونکر انجام دینا چاہیے اس کی بہترین تربیت ہو جاتی ہے۔ ایک ڈاکٹر اپنے پیشے کے ساتھ دعوتی کام کیسے انجام دے سکتا ہے، ایک کسان پیشۂ زراعت میں حصولِ مقصد کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ ایک معلم، ایک مفتی، یہ سارے لوگ اپنے اپنے شعبۂ زندگی میں دعوت و تبلیغ کا کام کس طرح انجام دے سکتے ہیں۔ کیمپ میں اس کا بڑا اچھا موقع ملتا ہے۔

اس مختصر تعارف میں مولانا سید حامد حسین مرحوم کے ذہن میں جو خاکہ تھا اس کے تمام خط و خال کو نمایاں نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اتنا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ تحریک کے لیے یہ پروگرام کس حد تک مفید اور کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ پھر لوگوں کو اپنے اپنے دائرۂ کار میں اس سے فائدہ اٹھانے کی طرف رغبت ہو سکتی ہے۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ۔

شرائط ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم پانچ رسائل پر دی جائے گی۔
۲۔ دس روپے ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے۔
۳۔ پانچ سے پندرہ پرچوں تک ۲۵ فیصد کمیشن دیا جائے گا۔ البتہ ۱۵ سے زائد پر ۳۰ فیصد کمیشن دیا جائے گا۔
۴۔ رسائل کی روانگی کا خرچ ادارہ برداشت کرے گا البتہ وی پی اور رجسٹری کا خرچ ایجنٹ حضرات کے ذمے ہوگا۔
۵۔ ہر مہینہ کا بل باقاعدگی سے ادا کرنا لازم ہوگا۔

منیجر "حیاتِ نو"

یادِ سید حامد حسینؒ

منصف مبارکپوری

شکل و صورت گوری چٹی، سرخی مائل، پُر اثر — دلکشا، موزوں، شگفتہ، جاذبِ قلب و نظر
لوحِ پیشانی کشادہ، ابروئے خنجر کا مثیل — لب پہ ہلکا سا تبسم، منھ میں اک سلکِ گہر
پُر کشش چہرے میں حسنِ دلبرانہ کی نمود — اس کا چہرہ تھا کتابی شکل کا گویا قمر
سروِ آزادِ چمن اس کا قدِ نازک خرام — بھولا بھالا دیکھنے میں تھا مگر بالغ نظر
خوش کلام و خوش خطاب و خوشنما طرزِ سخن — ماہرِ نقد و نظر، اور ایک اچھا دیدہ ور
اک مدبر، اک مفکر، اک زعیمِ خیر کوش — حق پذیر و حق پژوہ و حق شناس و حق نگر
فاش تھا اس کی نگاہ و نقد پر فکری فریب — جیسے چابکدست کے پیشِ نظر عیب و ہنر
جب کبھی آتا تھا وہ اسٹیج پر بہرِ خطاب — اس کی ہیئت سے عیاں تھا قائدانہ کرّ و فر
ناقدانہ شان سے وہ تجزیہ کرتا تھا جب — پاش کر دیتا تھا وہ نظریۂ باطل کا سر
اس کی (جرح و تجزیہ میں) شانِ بیباکی نہ پوچھ — جب اٹھاتا تھا وہ استدلال کے تیغ و تبر
ناقدِ رمزِ سیاست، آشنائے قیل و قال — اس کی شانِ نقد میں تھی جرأتِ شیرِ ببر
فتنۂ افکارِ نو میں تھا وہ مردِ دوربیں — اس کی آنکھوں میں بھی رخشاں تھا فطانت کا اثر
وضعداری کی رعایت، اس کا ہر رنگ و روش — اپنی وضعِ خاص کا تھا خود نظیرِ معتبر
خوش خصال و خوبصورت، خوش خرام و پُر کشش — جامعِ اوصافِ گوناگوں تھا وہ، المختصر
حجِ کعبہ کر کے جب عزمِ سفر اس نے کیا — اس کو کیا معلوم تھا اب آخرت کا ہے سفر
اس کے بابِ زندگی پر موت نے دستک دیا — ہو گیا پھر جان و تن کا ربط، اُف زیر و زبر
کس کو کیا معلوم تھا یوں زندگی مٹ جائیگی — ہے بشر کی زندگی بھی کس قدر نا معتبر
کل یہ تصویرِ شرافت سامنے موجود تھی — اب فقط آئینۂ دل ہی میں ہے وہ جلوہ گر

کون پیدا ہو کے اس دنیا میں رہ سکتا ہے روز
موت سے کس کو ہے اس دنیا میں اے منصف مفر

جاوید احمد خان ۔ بلریا گنج

ہمارے حامد حسین صاحب

میں نے امی سے جب فرمائش کی کہ میرے لیے بھی ایک ڈبہ میں آم کا اچار رکھ دیں تاکہ علی گڑھ کے "سرسید ہال" کھانے کے ساتھ اسے مجبوراً مرکب سمجھ کر کھا لیا کروں۔ وہ معذرت کے ساتھ بولیں کہ اس سال اچار کم بن پایا ہے اور یہ ڈبہ تو مولانا حامد حسین صاحب کے لیے ہے میں تو چپ ہو گیا لیکن وہ بے چین کہ اس کے بدلے میں مجھے کیا دیں۔

مجھے پتہ تھا کہ میری والدہ کا بنایا ہوا اچار حامد حسین صاحب کو نصیب نہ ہوگا۔ ان کی موت کی خبر سن کر گھر میں جو جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا۔ کوئی کہتا "اب کیا ہوگا"، کوئی سوچتا کتنی مبارک موت نصیب ہوئی، کسی کو جماعت یاد آگئی تو کسی کی نظر سید صاحب کی زندگی پر پڑی۔ عمر عزیز کو کوئی بے چین تھا تو کوئی مطمئن۔ اور میری گیارہ سالہ بھانجی اسکول سے ہانپتی کانپتی بھاگتی ہوئی آئی اور بولی کہ ماموں جان! کسی بڑے آدمی کا انتقال ہو گیا ہے، اسکول میں چھٹی ہو گئی ہے اور میں کلام پاک کی تلاوت کرنے جا رہی ہوں۔

حامد حسین صاحب کو اس وقت سے دیکھ رہا ہوں جب سے میں نے دیکھنا شروع کیا ہے۔ طفلی کے دن بھی کیا خوب ہوتے ہیں کچھ لوگوں کو دیکھ کر ڈر اور گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے، کچھ کو دیکھ کر انسیت اور اتنی قربت کہ پاس لپٹ جانے کو جی چاہے۔ جس دن ان کی آمد ہوتی تو گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی کہ حامد حسین صاحب آئے ہیں۔ سب سے کتنی محبت کرتے تھے اس کا ذکر کیسے کروں، لکھنؤ یا دہلی سے جب بھی گھر آتے تو والد صاحب سے ان کی ملاقات کے بعد خوشی کا عالم دیکھنے لائق ہوتا۔ زبان سے کوئی کم ہی جملہ نکلتا، سر سے پاؤں تک شگفتگی اور آنکھوں میں خلوص کی چمک دکھائی دیتی۔ سوچ کر سارا منظر یاد آتا ہے۔ ہم سب بھائی بہنوں کی بھاگم بھاگ، "نہانے کا انتظام کرو، چائے بناؤ، جلدی کھانا لاؤ، بستر لگاؤ، ہوا میں بچھا دو،

سرہانے لوٹے میں پانی رکھ دو۔" اور سید صاحب ہیں کہ جو پایا کھا لیا، جہاں جگہ ملی سو رہے۔ نہ انھیں یہ فکر کہ معیار گرا ہے اور نہ میزبان کو اندیشہ کہ خاطر میں کمی ہوئی۔ مرحوم ہم سب کو دیکھتے ہی اچک پڑتے اور ہاتھ پکڑ کر دیر تک اپنے ہاتھ میں لیے رہتے۔ ہلکے پھلکے مذاق کرتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے بذلہ سنج بن جاتے۔ اعظم گڑھ کی مقامی زبان میں کچھ غلط کچھ صحیح بول کر محظوظ کرتے اور اس دوران احساس بھی نہ ہونے دیتے کہ مولانا سید حامد حسین ہیں۔

وہ کتنے قیمتی تھے۔ گھر پر ان کے ارد گرد لوگوں کا جمع ہونا، "ابھی ہیں"، کوئی کچھ پوچھ رہا ہے، کسی سے وہ کچھ پوچھ رہے ہیں۔ سادگی اور محبت کا سرچشمہ ابتدا سے کہ اب تک وہی تھے جو پہلے دکھائی دیے۔ نہ کسی سے مرعوب ہوتے، نہ کسی کو مرعوب کرتے۔ شاید با مقصد زندگی کے تیور کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں اور جس کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے پوری سوانح حیات پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شکل و صورت، وضع قطع، چال ڈھال سید صاحب کی شخصیت میں ایک کشش کا درجہ رکھتی تھیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر احترام اور پاکیزگی کا احساس ہوتا۔ مکمل جسم کے گورے اور چمک دار آدمی، چوڑی چکلی ہڈیاں اور مردانہ انداز میں اپنے قدم اور بدن کی حرکات سے یہی تاثر دیتے تھے کہ خوبصورتی صرف عورتوں ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ ان کی آواز میں کیا کچھ نہیں تھا جو سننے والے کو زیر نہ کر سکے۔ اس میں جلال تھا، بے باکی تھی، سنجیدگی تھی اور ایک پیغام تھا جو قرآن میں غرق ہوئے بغیر ہاتھ نہیں آتا۔ غرض کہ وہ سب کچھ تھا جس کے لیے حضرت موسیٰ نے اپنے رب سے دعا مانگی تھی۔

اب مرحوم ہمیں چھوڑ کر جوار رحمت میں چلے گئے ہیں تو آج ان کی لیڈرشپ یاد آتی ہے۔ آج ان کی وہ انتظامی صلاحیت یاد آتی ہے جو زندگی میں کچھ چیزیں کھو کر ملتی ہے۔ آج وہ سب کچھ ذہن میں ہے جسے یاد کرنے کے لیے حافظے پر چوٹ دینے کی ضرورت نہیں۔ جماعت کی چھوٹی سے چھوٹی میٹنگ اور بڑے سے بڑے اجتماع میں مرحوم کا رول کتنا اہم ہوتا تھا، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے ان کو رات کی تاریکی اور دن کے اجالے میں دیکھا ہے۔ ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر کس طرح ایک بڑے کام کو انجام دیتے تھے یہ سوچ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہیں تحریر سے، کہیں تقریر سے تو کہیں پیکر عمل بن کر، وہ بھی اس طرح سے کہ نہ چہرے پر تھکاوٹ نہ آنکھوں میں مایوسی۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے کو یہ احساس کہ جب تک سید صاحب ساتھ ہیں وہ کیسے رک کر دم لے سکتا ہے۔ ایک دفعہ پوچھ بیٹھا کہ

مولانا اتنے سارے پروگرام اور سفر کس طرح یاد رکھے رہتے ہیں۔ فوراً جیب سے ڈائری نکالی اور میری آنکھ کے سامنے رکھ کر بتانے لگے کہ دیکھو یہ ۶ مہینے کا پروگرام مرتب ہو چکا ہے۔ دیکھ کر حیرت ہوئی مشغولیتوں کا تانا بانا ہندوستان اور تنزانیہ تک میں پھیلا ہوا تھا۔

باتیں تھوڑی بہت اب تک یاد ہیں۔ مرحوم نے ایک سال پہلے ضلع اعظم گڑھ میں تربیتی کیمپ لگایا تھا اور جماعت کے ہمدردان اُن کے ساتھ جس شدّت اور صالح جذبہ سے سماج سدھار کی اسکیم میں مشغول تھے اس سے کوئی دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا۔ قصبہ بلریا گنج میں صفائی کا ہفتہ منایا جا رہا ہے تو سید صاحب سب سے پیش پیش کبھی اس گلی میں نالیاں صاف کر رہے ہیں، کبھی اُس گلی میں کوڑے کرکٹ صاف کر رہے ہیں، کبھی اجنبی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مزاج پرسی کر رہے ہیں تو کبھی سگریٹ کا کش لیتے ہوئے اپنے کارکنوں کو سمجھا رہے ہیں اور محلّہ والے ہیں کہ کچھ تو شرم سے گھر کے اندر چھپے ہیں اور کچھ لپک کر مدد کر رہے ہیں لیکن ندامت سے جھکے جا رہے ہیں کہ اتنا معزز اور کریم آدمی آج ان کی نالیاں صاف کر رہا ہے۔ یہ باتیں ممکن ہے کسی کو معمولی لگیں لیکن ایسے منظر کو دیکھ کر دل کہہ اٹھتا ہے کہ مومن اور قرآن دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ سید صاحب سے مل کر معلوم ہوتا کہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے کس قدر فکرمند ہیں اور ایک ذمہ داری کے ساتھ ہمہ تن ہو کر اُس پر لگے ہوئے ہیں۔ خدا نے انھیں قلبِ مطمئنہ عطا کر رکھا ہے۔ نہ اپنی آسائش کی فکر، نہ اولاد کی فکر میں گم۔ کبھی کبھی کہہ بھی جاتے کہ میرے پاس رکھا ہی کیا ہے خدا کے دربار میں بخشش ہو جائے بس یہی خواہش ہے۔

سید صاحب کو اعظم گڑھ سے ایک لگاؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ خاص کر قصبہ بلریا گنج کے لیے وقت دینے میں وہ خوشی محسوس کرتے تھے۔ اِردگرد کے لوگ چاہے جاہل ہوں یا عالم سبھی سید صاحب کو دیکھنے کا، سننے کا اور پاس بیٹھنے کا شرف حاصل کرتے۔ کمال یہ تھا کہ جس سے ملتے اس کی شکل اور عقل دونوں کو ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ لوگ مختلف قسم کے سوالات کر رہے ہوتے تو ایسا جواب ملتا جس میں مسرت بھی ہوتی اور بصیرت بھی۔ ان کی تیز نگاہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی نجات قرآن کو مضبوطی سے پکڑنے میں ہے۔ وہ سیاسی حالات سے باخبر ہوتے، آنے والے دنوں کی تصویر اپنے خطبے میں بیان کر دیتے اور زمانہ گواہ ہے کہ سالوں پہلے انھوں نے جن باتوں کی طرف اندیشہ ظاہر کیا تھا اب وہ ہمارے سامنے موجود ہیں۔

سید صاحب کی زورِ خطابت اور شخصیت دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ان کا فطری وصف تھا۔ اس میں نہ کہیں بناوٹ تھی، نہ کوشش۔ منبر پر آتے ہی السلام علیکم کہتے، خدا کی حمد و ثنا کرتے، عموماً تقریر اقبال کے اشعار سے شروع کرتے اور انھیں کے اشعار پر ختم کرتے۔ پہلے ہی جملہ میں سننے والے کو اپنی جانب متوجہ کر لیتے پھر بڑا مشکل تھا کہ کوئی ان کے پھندے سے نکل جائے۔ انھوں نے اپنے سامعین کو کبھی خالی ہاتھ نہیں آنے دیا۔ ان کی تقریروں میں ہمیشہ فکر کی چاندنی ملی ہے اور روح و ذہن کی تسلی کا وہ سب کچھ سامان ملا ہے جو ایک بامقصد زندگی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ میں نے بہت سارے مقرروں کو سنا ہے اور میں نے بارہا دیکھا ہے کہ ہمارے سیاسی لیڈر تو روتے اور رلاتے ہیں اور مذہبی عالم قیامت سے اس طور پر ڈراتے ہیں جیسے خدا کی زمین پر اب عافیت کی گنجائش نہیں ہے لیکن سامنے بیٹھے ہوئے عوام یا تو خراٹے لیتے رہتے ہیں یا پھر اپنے پیر کی میل صاف کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر سید صاحب تقریر کرنے اٹھتے تو مجمع میں خاموشی ہوتی اور کبھی اکتاہٹ نہ معلوم ہوتی بلکہ سننے والے کو احساس ہوتا کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں وہ بھی تو وہی محسوس کرتا ہے۔ اُن کی تقریر میں ایک رَو ہوتی جس میں اپنی دلکش آواز کی بدولت وہ زور پیدا کر دیتے تھے جو آبشاروں میں پایا جاتا ہے۔ نہ کہیں اٹکتے نہ الجھتے بلکہ اطمینان اور اعتماد سے اپنی بات سامعین کے دلوں میں بٹھا دیتے۔ اُن کی تقریر میں سیاسی دُور اندیشی، مذہبی سوجھ بوجھ، مسلمانوں کی بدحالی، کہیں غربت کی شکل میں تو کہیں ثروت کی، کہیں انقلابِ ایران کا چرچا تو کہیں موجودہ عرب سربراہوں کے کارنامے اور اس کے بعد صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعوت جس سے اختلاف وہی کر سکتا تھا جس کی قسمت میں بدبختی لکھ دی گئی ہو۔ میں نے اعظم گڑھ میں ان کے شائقین کی تعداد دیکھی ہے۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں اُن کے عالمانہ رکھ رکھاؤ اب بھی ذہن میں تروتازہ ہوں گے۔ آدمی چاہے پڑھا لکھا ہوتا یا خدا کا سیدھا سادا بندہ، سید صاحب کی تقریر سننے کے لیے رات کی تاریکی میں میلوں کا سفر کر کے آتا اور دس گیارہ بجے جب تقریر ختم ہوتی تو اپنے گھر کو جاتا یا تو مطمئن ہو کر یا بے چین ہو کر۔

مرحوم نے کئی بار کہا تھا کہ اب بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن دل ابھی جوان ہے۔ کاش کوئی اُن کی بات سمجھتا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا پرتو نوجوانوں میں دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے سامنے ایک ایسی نسل تیار ہو رہی تھی جسے وہ اقبال کے شاہین سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ اپنی ذمہ داریاں نوجوانوں کے

کندھوں پر بڑی دیکھنا چاہتے تھے۔ پچھلے سال دہلی میں ایس آئی ایم کے اجتماع میں ان کی تقریر ہزاروں لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے تھے اور اجتماع کے ترانے سن کر عبرت حاصل کر رہے تھے۔

مرحوم کے انتقال کی خبر جب میں نے سنی تو ایک دن یاد تازہ کرنے کے لیے ان کی پچھلی تقریر کے کیسٹ سننے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں طبیعت ایسی ویسی ہونے لگی کہ اب ہم چہرہ دیکھنے سے محروم ہوگئے۔

میں سید صاحب کے ساتھ زیادہ نہیں رہا ہوں۔ لیکن جتنی بار بھی دیکھا ہے انھیں عجیب وغریب پایا ہے۔ وہ کہیں بھی اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔ جہاں بھی دیکھا ان کو اپنا پایا۔ بزرگوں کے ساتھ محو گفتگو ہوں یا بچوں کے ساتھ خوش گپیاں کر رہے ہوں، چٹکلے سنا رہے ہوں یا لطیفے سنا رہے ہوں ہر جگہ ان کی نفاست اور خوش ذوقی نمایاں رہتی۔ جماعت کے رفقاء کے بیچ گھر پر والد صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوتے، چائے نوشی کی صحبت گرم ہوتی اور پھر پتہ نہیں کیوں اس وقت بیٹھے ہوئے سارے لوگ بہت ہی بھلے لگتے اور یوں محسوس ہوتا کہ اس زمین پر نیکی اور سلامتی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ لوگ مسئلے پیش کرتے، خدشے ظاہر کرتے، کبھی ناامیدی کے کبھی شکایت کے لیکن مرحوم کی نظر حالات پر ہوتی مگر ہوش اور مایوسی سے دور۔ ان کی آنکھیں کسی صحیح اور مناسب حل کی طرف جاتیں اور لگتا کہ مسئلہ کچھ ہے ہی نہیں۔

میری سید صاحب سے اسلام کے علاوہ نجی زندگی اور ان کے تجربات کے بارے میں بھی بات ہوتی۔ جب وہ گھر پر اکیلے مل جاتے اور والد صاحب بھی مطب پر چلے جاتے تو انھیں تنگ کرنے کا اچھا موقع مل جاتا۔ انھیں گفتگو پر آمادہ کرنے کا طریقہ مجھے معلوم تھا۔ کرنا صرف یہ ہوتا تھا کہ کیتلی میں گرین لیبل کی گرم گرم چائے اور ایک شفاف گلاس ان کے پاس رکھ دیتا جس میں وہ لیموں کے چند قطرے ڈال کر خود ہی شکر ملاتے، پھر ان کی گل افشانی شروع ہو جاتی۔ ٹوپی اتارتے اور سر کے نصف سفید بال پر جس میں بزرگی بھی تھی اور رعنائی بھی، اپنے ہاتھ دو ایک بار پھیرتے پھر چائے ٹھہر ٹھہر کر پینا شروع کر دیتے اور کہتے کیا حال ہیں جاوید میاں سناؤ۔ بیوی بچے کیسے ہیں۔ کیسی گھٹتی ہے۔ میں نے کہا، بس ہمیشہ گھٹتی رہتی ہے تو بولے، ہائیں! یہ کیا؟ کہا کہ مولانا اختلاف کی قربت اتفاق کے شبہ سے ارفع ہوتی ہے۔ میرا مطلب سمجھ گئے تو مسکرا کر دعا دینے لگے کہ خدا شاد رکھے۔ ان کی باتیں سننے میں مزا آتا اور خدمت ملاطفت کرنے میں لطف ملتا۔ ایک تو بے پناہ سفر کرنے کی وجہ سے ان کا مشاہدہ گہرا ہوگیا تھا جہاں جاتے وہاں کی جگہوں کے نام، لوگوں کے نام اور کام کو ذہن میں محفوظ کر لیتے پھر اپنے مخصوص انداز میں

بیان کرتے تو بس سنتے ہی بنتا۔ ان کی گفتگو چاہے لندن کے بازاروں کی ہو یا افغانستان کے جانباز سپاہیوں کی، چاہے حیدرآباد کی تہذیب کا تذکرہ ہو یا بنگلور کے موسم کا۔ وہ ہر جگہ کی تصویر اپنے نہاں خانے میں چھپائے رہتے۔ شرط صرف یہ تھی کہ کوئی پوچھنے والا ہو ورنہ ان کا ذہن تو ہر وقت تحریک اسلامی کی آبیاری میں لگا رہتا۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا کہ جیسے اپنی زندگی کا نقشہ جوانی میں ہی بنا لیا ہو اور اس میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں آئی۔ ایک بار پوچھا کہ مولانا آپ تحریک اسلامی میں کب شامل ہوئے؟ کہنے لگے کیا پوچھ رہے ہو میاں پرانی باتیں۔ خدا کا شکر ہے اس کے دین کی خدمت میں عمر کٹ رہی ہے۔ یہ خدائے رب العزت کی مہربانی ہے۔ یہ جملہ کئی بار دہرایا۔ اب تو یہی تمنا ہے پروردگار محنت قبول کرلے۔ پھر وہ مزید کچھ نہ بول سکے۔ میں نے یوں ہی دبی زبان میں کہا کہ مولانا آپ کو دیکھ کر اپنے آپ سے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ کہنے لگے تمھاری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کہا اگر اجازت دیں تو کہوں۔ بولے، ضرور ضرور۔ یہاں میں نہیں چاہتا کہ اپنی نجی بات کہہ کر دوسروں کا وقت لوں۔ لیکن میری بات کچھ اس طرح سے تھی کہ ایک مسلمان ہونے کے ناتے مجھ پر جو کچھ فرض یا عائد ہوتی ہیں اس کو سوچ کر جب اپنی عملی زندگی پر نگاہ پڑتی ہے تو شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ فرائض کی خانہ پُری بھی کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ دل گواہی دینے لگتا ہے جو کچھ کر رہا ہوں وہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ اتنا ہی کہہ کر میں رک گیا لیکن میری کیفیت دیکھ کر بولے، کہو کہو کہہ ڈالو۔ میں نے انھیں بتلایا اب جبکہ بڑا ہو گیا ہوں تو یہ احساس بڑھتا جاتا ہے کہ والدین جس دین پر زندہ ہیں اور جس جانفشانی سے پاکیزہ زندگی کے لیے کوشش کرتے ہیں کم سے کم اس کی لاج رکھنے کے لیے اپنی کوتاہیاں دور کردوں تاکہ اپنی بے عملی سے ان کی زندگی میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ گو کہ دل میں ہمیشہ یہ کھٹکا رہتا ہے اور یہ تسکین نہیں ہو پاتی کہ ان کی آرزوؤں پر پورا اتر رہا ہوں۔ والدین کے احسانات اور ان کی قربانیاں سوچتا ہوں تو بھونچکا رہ جاتا ہوں۔ اس کے بعد کچھ باقی بچتا ہے تو یہی حسرت کہ ان کی خدمت کے لائق ہوں ـــ یہ کہہ کر میں چپ ہو گیا لیکن ان سے نگاہیں نہیں ملا پا رہا تھا۔ ان کی طرف دیکھا تو گردن نیچی کیے ہوئے بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ شاید کچھ نصیحت کریں گے یا کوئی مناسب طریقہ بتائیں گے تاکہ میں اپنی اصلاح کر سکوں ـــ اچانک آواز سنائی دی، یہ شرم برقرار رہے جاوید یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ پھر بولے، یہ شرم باقی رہے بھائی، تم سدا دعا کرتے رہو، غلطی کا احساس باقی

رہے بہت بڑی بات ہے۔ پھر بولے، اچھا اب جاؤ۔

مرحوم سے ایک بار جماعت کے مرکز دہلی میں ملاقات ہوئی۔ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے لان میں ٹہل رہے تھے۔ دیکھا تو دونوں ہاتھوں سے لپک لیا اور اپنی مسکراتی آنکھیں میرے چہرے پر بچھا دیں۔ اخوہ! اخوہ! کب آئے ہو، کیسے آئے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ سب ایک ساتھ پوچھنے لگے۔ مہمان خانہ میں لے گئے، پاس بٹھا کر والد صاحب اور گھر کے حال چال پوچھنے لگے۔ میں نے اختصار سے بتایا تو مطمئن ہوئے اور جماعت کے دوسرے لوگ جو قریب بیٹھے تھے سب سے تعارف کرایا۔ کہتے جاتے تھے اور ان کا دھیان ماضی میں گم تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے بول اٹھے، جانتے ہو ایک بار میں نے تمہارے والد کا امتحان لیا تھا۔ میں ان کی طرف دیکھنے لگا تو کہا کہ ایک بار میں نے ان کی تحریک میں سرگرمی اور لگن کا امتحان لیا تھا۔ بتانے لگے کہ مشرقی یوپی کے ایک اجتماع میں تمہارے والد نے خود شرکت نہیں کی تھی بلکہ اپنا نمائندہ بھیجا تھا۔ لیکن جب مغربی یوپی کا اجتماع لکھنؤ میں ہوا تو میں نے انھیں لکھا کہ پچھلے اجتماع کی تلافی کے لیے آپ کو بذاتِ خود لکھنؤ اجتماع میں شرکت کرنی ہوگی۔ پھر وہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو بتانے لگے کہ حکیم صاحب نے لکھنؤ کے اجتماع میں شرکت کی جس کے لیے انھیں شاہ گنج پلیٹ فارم پر رات بھر جاگنا پڑا۔ اور صبح کی ٹرین سے جب تھکے ماندے لکھنؤ پہنچے تو بولے کہ میں حاضر ہو گیا ہوں۔ سید صاحب نے پھر والد سے کہا کہ میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ شرکت کرتے ہیں یا نہیں۔ اب آپ بلریا گنج واپس جا سکتے ہیں۔ پھر میری طرف دیکھا اور کندھے پر اپنا نرم ملائم ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگے جسے دیکھنے کو اب آنکھیں ترس جائیں گی۔

سید صاحب حیدرآباد کے پروقار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت میں خاندانی تہذیب اور رکھ رکھاؤ رچا بسا تھا۔ وہ اپنی کسی حرکت سے بھی خاندانی احساسِ برتری کو ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرتے۔ لیکن گھریلو زندگی میں نت نئی خوبیوں کی ایسی کمی بھی نہیں تھی جسے دیکھ کر دل کے دریچے نہ کھل جائیں۔ کیا کیا بیان کروں۔ ایک مرتبہ مرحوم کے دہلی والے مکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک نو مسلم جسے انھوں نے باتوں ہی باتوں میں اپنی لڑکی بنا لیا تھا اس کی شادی تھی۔ میں مکان پر پہنچا تو دیکھتے ہی چہرہ جگمگا اٹھا۔ چہک کر بولے، آئیے آئیے۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر اہلاً و سہلاً کہنے لگے۔ قریب پہنچا تو اپنے پاس بٹھایا۔ مکان کیا تھا شیشے کی طرح چمکتا ہوا تھا۔ ہر چیز دکھا رہے ہیں۔ یہ دیکھو آرٹ کا

نمونہ ہے۔ میرے منجھلے لڑکے وجاہت نے بنایا ہے۔ انگریزی میں کہا "ہی از این آرٹسٹ"۔ اخباروں کی بات چلی تو چھوٹے لڑکے سے ملوایا۔ ان سے ملو یہ قومی آواز میں سب ایڈیٹر ہے۔ اور یہ بڑا لڑکا ہے نیوز ایجنسی میں کام کرتا ہے۔ میں کبھی سید صاحب کی طرف دیکھتا کبھی لڑکوں کی طرف۔ گھر کی رونق اور لڑکوں کی خوش اخلاقی دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہ تربیت اور حسن و سلیقہ یونہی نہیں آجاتا بلکہ پوری زندگی کی کاوش درکار ہوتی ہے۔

سید صاحب کو اکثر اپنی بیوی بچوں سے دور رہنا پڑتا تھا۔ بڑھاپے میں اس صورت سے دوچار ہونا معمولی بات نہیں۔ اس کیفیت کو وہی سمجھ پائیں گے جو اولاد سے دور رہتے ہیں۔ کیسی کیسی محرومیاں اور بےچینیاں درپیش ہوتی ہیں۔ ایک بار لکھنؤ میں ان کے ذاتی کمرہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جلدی میں تھے۔ مجھ سے کہا کہ بس بیٹھو ابھی آیا اور پاس ہی غسل خانے میں چلے گئے۔ ان کے چھوٹے سے کمرے کو دیکھ کر دل بھر آیا۔ زندگی کا یہ ساز و سامان کتنا مختصر ہے جیسے بارگاہِ ایزدی میں کہہ کر آئے ہوں کہ بس تیری دنیا سے ہو کر ابھی آتا ہوں۔ لکڑی کی چوکی جس پر پتلی سی دری بچھی ہوئی، سامنے میز پر قرآن مجید، اسٹول پر چمڑے کا پرانا بیگ جس میں سفر کی ساری ضروریات رکھی ہوئی ہیں اور اسی میں ڈالڈا کا خالی ڈبہ بھی اس مقصد سے رکھا تھا کہ اسے دہلی لے جائیں گے تاکہ گھر پر کسی کام آسکے۔

مرحوم کے ساتھ پچھلے سال لکھنؤ سے دہلی کا سفر کرنا پڑا۔ انھیں بنگلور میں مجلس مشاورت کے ہنگامی اجلاس میں شرکت کرنی تھی۔ اچانک دہلی کے سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ گرمی کا موسم، ٹرینوں میں بھیڑ کا وہ عالم کہ پاؤں رکھنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ تمام حربے آزمائے لیکن کہیں بھی ریزرویشن نہیں ملا۔ مجھ سے بولے کہ جاوید اب کیا کیا جائے۔ میں نے کہا کہ ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ صبح ہی گومتی ٹرین پکڑی جائے تاکہ کم سے کم بیٹھنے کو جگہ مل جائے۔ سن کر آمادہ ہو گئے اور بولے، ایسا ہی کرتے ہیں۔ صبح تڑکے ہم دونوں لکھنؤ اسٹیشن پہنچے۔ میں نے دیکھا کہ مولانا تھوڑا سا پیدل چل لیتے تو ہانپنے لگتے۔ ان سے میں نے کہا تھوڑا سا رک کر آرام کیجیے ابھی تو کافی وقت ہے۔ کہا نہیں بس چلیے چلو، ٹرین ہی میں آرام ہوگا۔ اتفاق سے جس ڈبے میں ہم گھسے وہ بالکل خالی تھا اور صاف ستھرا بھی۔ مولانا ایک سیٹ پر بیٹھ گئے اور اپنا بیگ رکھ کر انگریزی اخبار کی سرخیاں دیکھنے لگے۔ میں نے چائے اور بسکٹ دیا تو کھایا۔ اتنے میں گاڑی چلنے لگی اور ایک ہی گھنٹہ میں کانپور آگیا۔ لیکن ہم دونوں نے جو غلطی کی تھی وہ یہ کہ ریزرویشن والے ڈبہ میں بیٹھ گئے تھے جو کانپور

کے مسافروں کے لیے تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ اپنی اپنی سیٹ پر قبضہ جمانے لگے۔ مولانا کی سیٹ کے پاس بھی نوجوان مرد عورت کا خوبصورت جوڑا آیا اور اس نے انگریزی میں معذرت چاہتے ہوئے انھیں اٹھا دیا اور جھٹ سے سیٹ پر بیٹھ کر دونوں مونگ پھلیاں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اخبار کے کچھ اوراق لے کر دروازے کی جگہ کے پاس بچھا کر مولانا کو بٹھا دیا اور خود بھی پاس بیٹھ گیا۔ اب کسی دوسرے ڈبے میں جا کر جگہ ڈھونڈنا بے کار تھا۔ اُن کی شکر گزاری اور قناعت دیکھنے لائق تھی۔ بولے، دیکھو ہم لوگ کتنے آرام سے فرش پر پلتھی مارے ہوئے ہیں۔ گاڑی چلی جا رہی تھی۔ میں نے کہا، مولانا آپ تو سال کے بیشتر دنوں میں سفر ہی کرتے رہتے ہیں اور اس عمر میں کرتے ہیں۔ پھر جن جن صعوبتوں سے گزرتے ہیں وہ سب کے بس کی بات نہیں۔ سن کر مسکرائے اور اپنی دل نشیں نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر اپنی سگریٹ جلا کر تحریک اسلامی میں آنے سے پہلے اور بعد کی زندگی کچھ اس طرح بیان کرنے لگے کہ جی چاہتا ہے آج اسے یکسر بھول جاؤں۔ اپنی خاندانی شان و شوکت کو چھوڑ کر اور ملازمت کے منصب سے سبکدوش ہو کر ہندوستان کے شہروں، گاؤں اور گلیوں گلیوں میں گھوم کر جس مقصد کے لیے اپنے تن من دھن کی قربانی دے رہے تھے اس کا تذکرہ کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہ تو ان کے ہم عمر ہی بیان کریں گے۔ میں جو بات کہنے جا رہا تھا وہ یہ کہ ٹرین میں جس جگہ ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے وہاں مسافروں کو چائے اور ناشتہ سپلائی کرنے والے ریلوے کے ملازم آ گئے اور بولے ـــــ صاحب، اٹھ جائیے، یہاں پر چائے اور ناشتے کے برتن رکھیں گے۔ میں نے کہا کہ نہیں اور رکھ لو مگر جب نہیں مانے تو میں اور مولانا اخبار لپیٹ کر اٹھ گئے اور دروازے کے سہارے کھڑے ہو گئے۔ ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے مسافر پاس بیٹھی ہوئی عورتوں سے اور کبھی بچوں سے اس طرح محو گفتگو تھے جیسے اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہوں۔ مجھے شرم یہ آ رہی تھی کہ میری عمر کے نوجوان سید صاحب کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اور انھیں کیسے گوارا ہوتا ہے کہ ایک بزرگ آدمی پاس ہی کھڑا ہے۔ مرحوم گھنٹوں کھڑے رہے۔ کبھی اِس پیر پر تو کبھی اُس پیر پر۔ اور میری آنکھیں تھیں کہ انھیں دیکھ رہی تھیں۔ اُن کی خودداری کہ کس حال میں کھڑے ہیں صبر اور سکون سے ہیں۔ مجھے ایسی حالت میں اقبال بہت یاد آتے ہیں اور "خودی" کا فلسفہ خون میں گردش کرنے لگتا ہے۔

دھیرے دھیرے پھر کچھ لوگ اپنی سیٹ سے اٹھ کر دروازے کے پاس ہوا خوری کے لیے آنے لگے۔

اس لیے نہیں کہ مولانا کو بیٹھنے کا موقع دیں گے بلکہ یہ کہ بیٹھے بیٹھے تھک گئے تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ کھڑے ہی کھڑے سید صاحب سے ان لوگوں کی گفتگو شروع ہو گئی اور ذرا سی دیر میں وہ سب کچھ ہونے لگا جو مولانا کی زندگی کا مشن تھا۔ میں دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا کہ یہ پڑھے لکھے بنے ہوئے انسان جنھیں اپنے آرام کے سامنے بزرگوں کا ذرا بھی احساس نہیں اور سید صاحب تھے کہ جیسے ان کو موقع مل گیا ہو۔ جہاں تک میرے کانوں میں آواز گونج رہی ہے انھوں نے بتلایا کہ وہ جماعت اسلامی کے زونل سکریٹری ہیں۔ جماعت کا مقصد کیا ہے۔ ہندوستان کی بدحالی کی وجہ کیا ہے اور کچھ مسلمانوں سے متعلق باتیں جن کا چرچا اخباروں میں رہتا ہے۔ کچھ دیر تک لوگ سید صاحب کی باتیں سنتے رہے۔ پھر اپنی اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں چائے والے بھی اپنے برتن اٹھا لے گئے تو میں نے دوبارہ اخبار بچھا دیا اور مولانا پھر فرش پر دروازے کے پاس بیٹھ گئے۔ اتنی ہی دیر میں علی گڑھ کا اسٹیشن بھی آ گیا اور میں نے اجازت مانگی کیونکہ مجھے وہیں اترنا تھا۔ فوراً بولے رکو! پھر سفر کے اخراجات اور ٹکٹ جو ایک ساتھ خریدے گئے تھے سب جوڑ کر مجھے پیسہ لوٹا دیا۔ پلیٹ فارم پر گاڑی رکی تو میں سلام کر کے ٹرین سے باہر آ گیا۔ لیکن طبیعت نہیں مانی تو ایک نظر انھیں دیکھنے کے لیے پھر پاس پہنچا اور پوچھا کہ کوئی ضرورت تو نہیں۔ انھوں نے الحمد للہ کہا۔ اور جب میں چلنے لگا تو بولے کہ حکیم صاحب (والد) کو خط لکھنا تو میرا سلام کہنا۔ گاڑی دھیرے دھیرے رینگنے لگی۔ میں اپنے ہاتھ میں اٹیچی لیے پلیٹ فارم پر کھڑا انھیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ٹرین جس میں ہمارے حامد حسین صاحب بیٹھے ہوئے تھے پل بھر میں میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ یہی میری ان سے آخری ملاقات تھی۔

"اسی طرح اُردو کا معاملہ ہے۔ ہمارے خیال میں حکومت چاہے اُردو کو قانونی طور پر تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن اگر مسلمانوں کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اردو میں عربی کے بعد اسلام اور اسلامی تہذیب کا بہت بڑا سرمایہ محفوظ ہے تو وہ خود اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کا معقول انتظام کریں گے۔"

مولانا سید حامد حسینؒ ـــــ "ہندوستانی مسلمان کیا کریں صفحہ ۲۸"

مولانا مقبول احمد فلاحی ناظم جماعت اسلامی ہند
علاقہ بریلی یوپی

داستان شفقت و عاطفت

مولانا سید حامد حسینؒ ایک شجر سایہ دار تھے جس کی عاطفت میں آکر ہر کارکن ایک سکون اور طمانیت محسوس کرتا اور نیا عزم و حوصلہ لے کر پھر میدانِ کارزار میں کود پڑتا۔ مقبول احمد فلاحی اپنے مخصوص انداز میں رازِ دل بیان کرتے ہیں۔

یوں تو جو بھی اس دنیا میں آیا ہے اسے کسی نہ کسی دن اس دارِ فانی کو خیر باد کہنا ہے۔ ہم آئے دن مختلف حیثیت اور مراتب کے لوگوں کے انتقال کی خبریں سنتے رہتے ہیں۔ ان خبروں سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور اپنے رنج و غم کا مختلف طریقوں سے اظہار بھی کرتے ہیں۔ مگر مولانا سید حامد حسین صاحب کی رحلت نے مجھے منفرد انداز سے متاثر کیا ہے۔

والدین کی طویل سرپرستی کے بعد سید مرحوم کی صورت میں ایسا سرپرست ملا تھا جس کی بیکراں شفقت و عاطفت، الفت و رحمت نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ میری تحریکی زندگی کے آغاز کے بھی وہی ایام تھے جب سید صاحب دوبارہ امیر حلقہ اترپردیش کی حیثیت سے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ مئی ۱۹۸۰ء سے مرحوم کے وصال تک کوئی ایسا لمحہ نہیں آیا جب میں سید صاحب کی شفقت سے محروم رہا۔ اس مختصر سی قربت کے چند ذاتی نوعیت کے واقعات قلم بند کر رہا ہوں۔ شاید موصوف کی عظیم شخصیت کو سمجھنے میں قارئین کو کچھ مدد ملے۔

نہیں کہہ سکتا کہ میری کم عمری تھی یا جذبہ احترام و توقیر اور منصب امارت سے وفا کیشی اور اطاعت شعاری کہ دیگر ذمہ دارانِ حلقہ اور سید صاحب کے معاونین جب کسی وجہ سے کوئی بات براہِ راست ان کی خدمت میں نہ کہہ پاتے تو ان کے جذبات و احساسات کو سید صاحب تک پہنچانے

میں میں رابطے کا کام کرتا۔ عموماً یہ باتیں تجاویز و مشورے اور تنقید و تبصرے پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ سید صاحب کی شفقت سے میں اپنے اندر یہ جرأت پاتا کہ بلا جھجک ان کی خدمت میں تمام باتیں پیش کر دیتا۔ اور سید صاحب نہایت خوشدلی سے اسے سن لیتے اور اس کی روشنی میں مناسب اقدامات کرتے۔ میں نے خود کئی بار موصوف پر تبصرے کیے۔ ان کی کسی رائے پر تنقید کی۔ ان کے کسی فیصلے پر رد و کد کیا۔ مگر موصوف کبھی ان کا برا نہ مانے بلکہ ہمت افزائی کی اور اگلے مرحلے میں مزید شفقت اور قربت کا احساس دلایا۔

مئی ۱۹۸۲ء کا واقعہ ہے۔ سید صاحب، ان کے معاون خصوصی اور راقم پر مشتمل سہ نفری وفد کا پہاڑی اضلاع کے دوروں کا پروگرام بنا۔ دورے کے اختتام پر سید صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں بے لاگ انداز سے اُن پر تبصرہ لکھ کر ان کی خدمت میں ارسال کروں۔ میرا یہ پہلا موقع تھا جب سید صاحب کو میں نے اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ یوں تو پہلے بعض لوگوں سے موصوف کے عادات و اطوار اور صلاحیتوں کے بارے میں سنتا رہا تھا چنانچہ واپس آکر بعض حسی مشتاق باتوں اور بعض مشاہدات پر مشتمل ۱۲ نکاتی تبصرہ ارسال کر دیا اس تصور سے کہ تحریک اسلامی کا مزاج سخت ترین تبصروں کا متحمل ہے۔ میری تحریر میں کافی درشتی آگئی تھی۔ بہر حال تبصرہ ارسالِ خدمت کر کے ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔ اس تحریر کے جواب اور اگلی ملاقات میں سید صاحب کے رویے کے بارے میں طرح طرح کے خیالات ذہن میں آئے مگر یقین مانیے چند ہی روز بعد جب ملاقات ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نہ صرف یہ کہ سابقہ رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ شفقت و اپنائیت میں اضافہ ہو گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جس نے سید صاحب کی عالی ظرفی اور عظمت کے آگے میرے دل کو جھکا دیا۔ بعد میں جوں جوں قربت بڑھتی گئی مجھے اپنے سابقہ تبصرہ پر پشیمانی محسوس ہونے لگی کیونکہ بیشتر تبصرے بدگمانی اور کم فہمی یا لاعلمی پر مبنی تھے۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔

سید صاحب کی دوسری نمایاں خصوصیت جسے میں نے اسی قربت کے ایام میں نوٹ کیا وہ ان کی چھوٹوں کی حوصلہ افزائی اور دل بستگی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا کہ مرحوم ایک خاص اسکیم کے تحت باقاعدہ تحریک اسلامی کے لیے کارکن تیار کر رہے ہیں۔ آخری ایام میں اس کیفیت میں نمایاں

اضافہ محسوس ہونے لگا تھا۔ کبھی کبھی کہتے کہ اب دورِ اول کی قیادت رفتہ رفتہ دنیا سے اٹھ رہی ہے۔ نہیں فکر ہے کہ کیونکر اس خلا کو پُر کیا جاسکے گا۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی اپنے معاونین اور ماتحتین کی فکری اور علمی نشوونما اور تعمیر و ترقی میں اپنے کسی فیصلے یا عمل سے مانع نہیں ہوتے بلکہ برابر اکساتے رہتے اور اپنے طور پر شخصیت کو پروان دینے کے لیے نئے نئے طریقے سوچتے رہتے۔ کم فہمی کی بنا پر بسا اوقات لوگوں پر جھنجھلاہٹ طاری ہو جاتی مثلاً بغیر سابقہ اطلاع کے خطابِ عام کے لیے کھڑا کر دینا۔ سمپوزیم کی صدارت سونپ دینا۔ کسی پروگرام میں رنگ بھرنے اور اپنے طور پر کامیاب بنانے کا مکلف کر دینا۔ کوئی مقالہ یا رپورٹ تیار کرنا۔ کسی اہم پروگرام پر تبصرہ کی ذمہ داری سونپ دینا وغیرہ۔

لوگ اس اندازِ تربیت کا کیا مفہوم لیتے ہیں میں نہیں جانتا۔ لیکن کم از کم میں اپنے بارے میں اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت جو کچھ بھی لسٹم پسٹم کاروانِ تحریکِ اسلامی کے ساتھ چل رہا ہوں اس کے پیچھے سید صاحب کی تربیت اور رہنمائی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ورنہ جب بریلی ڈویژن کی نظامت میرے سپرد کی گئی تھی تو میں نہیں سمجھتا تھا کہ اپنی کم مائیگی، فکری اور عملی کوتاہیوں کے ساتھ چند ماہ بھی چل سکوں گا۔ سید صاحب اپنے کسی کارکن کی ہمت شکنی نہیں کرتے۔ ایسا بھی ہوا کہ بعض پروگرام سید صاحب کے علم میں لائے بغیر بالا بالا تیار کر لیے گئے۔ بعد میں جب سید صاحب کو اس کی اطلاع ملی تو اس پروگرام کے محاسن پر خوب خوب داد دی۔ جہاں جہاں جاتے پروگرام کے تعمیری پہلو کو خوب اجاگر کرتے۔ اگر اس میں کوئی کمی دیکھتے تو نہایت خوبصورتی سے اس کی اصلاح فرما دیتے۔

عموماً بزرگ حضرات اپنے چھوٹوں کی رایوں سے اختلاف کرتے وقت بعض جملوں اور اپنی پیرانہ سالی اور تجربہ کاری کا سہارا لیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہہ دینا "کہ آمدی کی پیرشدی" "پدری نہ پدری کا شوربہ" "یہ بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے ہیں" وغیرہ۔ گویا ان چیزوں سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سید صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ کبھی اپنی رائے منوانے کے لیے ان جملوں کا سہارا نہیں لیتے۔ یہ بڑی اعلیٰ ظرفی کی بات ہے کہ کسی ماتحت کی بات اگر زیادہ درست ہوتی تو فوراً اپنی رائے سے رجوع فرما لیتے اور اگر رائے غیر معقول ہوتی تو دلائل سے اس کی نامعقولیت واضح فرما دیتے۔ حتیٰ کہ لوگ خود اپنی رائے سے رجوع کر لیتے۔ یہی سبب ہے اس دوران سید صاحب کے ہر فیصلہ

اور پروگرام پر غور کیا۔ جو بات نہیں سمجھ میں آتی اسے سمجھنے کی پوری کوشش کی نتیجۃً بحمد اللہ اس پونے دو دہے میں سید صاحب کا کوئی پروگرام ایسا نہیں رہا جس پر مجھے شرح صدر نہ رہا ہو چاہے وہ دعوتی، تنظیمی، تربیتی پروگرام رہے ہوں یا سماج سدھار کیمپ۔ قائد از منصب سے مرحوم کے اندر ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے ماتحتین، معاونین اور مامورین سے انتہائی قربت، محبت اور مروت کا برتاؤ کرتے۔ ایک موقع پر جماعت کے کچھ احباب اس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ قیادت کے اندر کون کون سی نمایاں خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اس موقع پر میں نے کہا تھا کہ اور صلاحیتوں کے ساتھ مامورین اور ماتحتین سے محبت و شفقت کی خوبی لازمی طور پر ہونی چاہیے۔ مجھے یاد ہے کسی نے ازراہِ مذاق چٹکی لی تھی "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں" لیکن اب بھی کسی قائد کے اندر اسی خصوصیت کو ضروری سمجھتا ہوں۔ سید صاحب کو میں نے اس پہلو سے بہت کامیاب پایا۔ باوجود اس کے ان کی اصول پسندی اور باقاعدگی سے کچھ لوگوں کو شکایت ہو سکتی ہے۔ مگر اس شکایت میں قصوروار وہ لوگ ہیں جو اصول و ضابطہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ پھر بھی جب جب کسی پر کوئی برا وقت آن پڑا سید صاحب دل گرفتہ اور اشکبار دیکھے گئے۔ ملاقات کے وقت اور بذریعہ خطوط لوگوں کی خیر و عافیت معلوم کرنا، اہل و عیال اور ذرائع معاش کے بارے میں پوچھنا اور دلجوئی کرنا موصوف کا عام طریقہ تھا۔

معاونین اور ماتحتین کی خبرگیری اور انسیت کی وجہ سے نئے لوگوں کو باہم دگر رشتہ داری کا خیال ہوتا۔ کئی مرتبہ خود میرے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے ہیں جب لوگوں نے سید صاحب سے میرا رشتہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موقع پر میں فطرتِ انسانی پر فتح کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ الفت و محبت اور عزت و توقیر اضافی اور معروضی نوعیت کی چیزیں ہیں۔ اگر کہیں کوئی بات اس عمومی شفقت و محبت سے ہٹی ہوئی نظر آتی ہے تو اس کے پیچھے چھوٹوں کی جھوٹی عزت کی خواہش اور بڑوں کی بے ادبی اور عدم توقیر کارفرما ہے۔ سید صاحب کبھی کبھی کہا کرتے کہ باہر کی دنیا میں حد سے زیادہ لینے اور رحمت و محبت دینے کا نتیجہ ہے کہ گھر میں اہل و عیال کو کما حقہٗ محبت نہیں دے پا رہا ہوں۔

سید مرحوم کی بلند پایہ RESERVE شخصیت میں ایک نمایاں خوبی زندہ دلی اور خوش مزاجی

اور خوش ذوقی کا پایا جاتا ہے۔ سید صاحب تفریح بھی کرتے، لطیفے بھی سناتے، مذاق بھی کرتے۔ میں نے مختلف مواقع پر مختلف انداز سے دیکھا مگر بہر صورت کبھی انھیں اپنے مقام و منصب سے فروتر نہیں پایا۔ شخصیت کی یک رنگی کسی کی بزرگی کی بہت بڑی دلیل ہے۔

بعض لوگ کچھ مخصوص ماحول میں اپنے منصب کی پاسداری یا اظہارِ شخصیت کے لیے کچھ مصنوعی غلاف چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب تصنع کا غبار چھٹتا ہے اور وہی حضرات جب دوسرے ماحول میں پہنچتے ہیں تو وہی سوقیانہ اور گھٹیا حرکتیں ان سے سرزد ہونے لگتی ہیں جس کا مصنوعی ماحول میں تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سید صاحب اس اظہار و نمائش سے پاک تھے۔ وہ فطرتاً R E S E R V E تھے۔ لیکن یہ رزرویشن کسی خاص وقت اور خاص ماحول کے ساتھ مختص نہیں تھا۔ ایک موقع پر سید صاحب کی موجودگی میں کچھ تفریح طبع کی گفتگو ہو رہی تھی۔ میں بھی اس میں حصہ لے رہا تھا۔ ایک صاحب کو میری یہ "گستاخی" پسند نہیں آئی۔ انھوں نے اپنی تیز طرار نظروں سے پچھاڑا اور چپکے سے فرمایا "میاں بہت بولتے ہو کسی روز ناپ دیے جاؤ گے۔" مجھے یہ بات بہت کھلی اور فکرمند ہو کر چپ چاپ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ سید صاحب پورے ماحول کو بھانپ گئے۔ وہیں فرماتے ہیں، "میاں مقبول تمھارا یو پی بڑا خشک صوبہ ہے ذرا سا کھل کر زندہ دلی کی بات کرو تو لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ کوئی بہت بڑا قصور اور خلافِ تقویٰ کوئی کام ہو گیا ہے۔ تمھیں جنوبی ہند لے چلیں گے وہاں اس کے برخلاف نہایت زندہ دل لوگ ملیں گے۔ اور کہا ہم سب ایک راہ کے راہی اور تحریکِ اسلامی کے کارکن ہیں۔ بے جا تکلفات مجھے پسند نہیں ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سید صاحب کی بھی چیزوں کو ہم بلاتکلف استعمال کر لیتے۔ موصوف اس کا برا ماننے کے بجائے خوش ہوتے۔

اللہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے!

بقیہ:- سید صاحب کی اہلیہ جواب دیتی ہیں

جواب:- قارئین کے لیے پیغام؟ ارے میں کیا اور میرا پیغام کیا۔ البتہ اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ آج کے دور میں بھی اسلام کی دعوت دینا جہاد سے کم نہیں ہے۔ قارئین اقامتِ دین کی کوششوں میں ہر قسم کے آزمائشی دور کو لمحاتی سمجھ کر خندہ پیشانی سے گذاریں۔

ش. شمیم خان بستوی۔ علیگڑھ

مولانا سید حامد حسینؒ کے انتقال پر

وہ ترا حسنِ تکلم اور ضبطِ خامشی
تیرے خاکے میں نمایاں رنگہائے دلکشی
قابلِ صد رشک تیری زندگی بھی موت بھی
منہ کو آتا ہے کلیجہ سوچتا ہوں جب کبھی

صد ہزاراں غم بپا شد ہمسرِ غمہائے تو
می چکد از دیدۂ تحریکِ اسلامی لہو

ہند میں نظریۂ اسلام کا وہ ترجماں
ہائے وہ جوشِ خطابت ہائے وہ زورِ بیاں
طرزِ استدلال تھا جیسے کوئی کوہِ گراں
گنگ تھی سن کر جسے ایوانِ باطل کی زباں

غمزدہ ہوں ایسی اب تقریر فرمائے گا کون
سوزشِ فکر و عمل سے دل کو گرمائے گا کون

تو دیارِ رحمتِ حق میں ہوا حق پر نثار
ہم تری فرقت میں تھے ہندوستاں میں سوگوار
تو ہوا باغِ ارم باغِ جناں سے ہمکنار
ہم خزاں دیدہ چمن میں کر رہے تھے انتظار

ناگہاں آئی خبر تو اس جہاں سے چل بسا
آگئی قدموں میں تیرے رشکِ صد حسنِ بقا

محمود احمد خان اورنگ آباد

ایک عظیم قائد ایک عظیم مربی

سید صاحب کی دو سالہ جدوجہد کی ایمان افروز روداد، رفقا کی تربیت کے موثر طریقے اور دعوت و تبلیغ کے دلنشین انداز، سید صاحب کے قریبی دوست اور رفیق کار محمود خان صاحب اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں۔ (ادارہ)

مولانا سید حامد حسین صاحب مرحوم و مغفور سے میرے تعلقات ۱۹۵۲ء میں قائم ہوئے۔ یہ تعلقات ابتدا میں محض تحریکی نوعیت کے تھے، لیکن رفتہ رفتہ گہرے ہوتے گئے اور دونوں خاندانوں تک وسیع ہو گئے اور جب بھی موصوف اورنگ آباد تشریف لاتے اپنے اعزہ و اقربا کے ہوتے ہوئے میرے یہاں ضرور قیام کرتے۔

تعلقات کی گہرائی کی وجہ سے موصوف اپنے سفر حج میں بھی جدہ کے مختصر قیام کے دوران میری لڑکی اور داماد کے یہاں چار روز تک مقیم رہے۔

مولانا سید حامد حسین مرحوم کا آبائی وطن اچلپور ضلع امراوتی مہاراشٹر اسٹیٹ ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اچل پور میں ہوئی۔ اس کے بعد انجمن ہائی اسکول کھام گاؤں ضلع بلڈانہ میں زیر تعلیم رہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ورنگل کے

سرکاری ہائی اسکول میں معلمی کے فرائض انجام دیئے اور دوسری عالمگیر جنگ کے دوران انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔

مرحوم اچلپور کے ایک معزز خطیب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے اعزہ و اقربا اور دوستوں کا جال پورے ودربھ کے علاقہ میں پھیلا ہوا ہے۔

آپ اس دور میں ایک خوبصورت خوش پوش، نفاست پسند، CLEAN SHAVE اور انتہائی FASHIONABLE یار باش نوجوان تھے۔ کمیونسٹ نظریات کے حامل اور "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" زندگی کا مطمح نظر تھا۔

فوجی ملازمت کے دوران جب آپ مہاراشٹر کے ایک شہر جالنہ میں مقیم تھے لٹریچر کے ذریعہ جماعت اسلامی کا ابتدائی تعارف ہوا۔ جن لوگوں کے ذریعہ آپ جماعت سے متعارف ہوئے وہ بہت باصلاحیت لوگ نہیں تھے۔ ان سے میں شخصی طور سے واقف ہوں۔ ان میں سے کوئی رکن نہ بنا اور اگر بنا بھی تو اب نہیں ہے۔ مگر ان کو کیا معلوم تھا کہ جس شخص پر وہ کام کر رہے ہیں وہ آئندہ چل کر تحریک اسلامی کی ایک عظیم شخصیت بننے والی ہے۔

آپ اپریل ۱۹۴۹ء میں تحریک کے رکن بنے اور ۱۹۵۱ء میں صرف ۵۰ روپے سے قلیل مشاہرہ پر تحریک اسلامی کے فارغ کارکن اور حلقہ حیدرآباد کے معاون قیم بنے۔ (ان دنوں امیر حلقہ کے لئے قیم حلقہ کی اصطلاح مستعمل تھی) اب آپ پر دوروں، دفتری امور اور تنظیم و تربیت کی اہم ذمہ داریاں آپڑی تھیں۔ آپ نے ان ذمہ داریوں کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ اللہ نے آپ کو غیر معمولی تنظیمی صلاحیت عطا کر رکھی تھی۔

تحریک اسلامی سے وابستگی کے ابتدائی دور میں آپ فن خطابت سے آشنا نہ تھے۔ جمعہ کے خطبوں میں خطبات کے مضامین پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ بعد میں تحریک اسلامی کے ممتاز خطباء میں آپ کا شمار ہوا۔

راقم الحروف چونکہ مرحوم ہی سے متاثر ہوکر تحریک میں شامل ہوا اس لئے اس کو میں قدرے تفصیل سے بیان کروں گا تاکہ اس سے ان کی ابتدائی تحریکی زندگی طریقۂ کار، اور طریقۂ تربیت کا اندازہ ہوسکے۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے، میں نے تحریک اسلامی کے لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اور جماعت کا تعارف سماعی تھا۔ تحریک کے کارکنوں کے غیر حکیمانہ رویے، غیر معمولی تقشف اور کچھ مخالفین جماعت کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوکر میں جماعت سے اس قدر بدظن تھا کہ گھر میں لٹریچر ہوتے ہوئے بھی اس کو ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ جماعت سے وابستہ بھائی اور انکی داڑھی کا مذاق اڑاتا تھا اور جماعت کو افتراق بین المسلمین پیدا کرنے والی اور دین کی قدیم طور طریق کی مخالفت کرنے والی تحریک سمجھتا تھا۔ ہمارے دو چھوٹے بھائی جماعت کے ہمدرد تھے۔ جمعہ کا دن تھا، سنا کہ جماعت اسلامی کے پورے حیدرآباد اور برار کے قائد مولانا سید حامد حسینؒ آج اورنگ آباد شہر کے دورے پر تشریف لارہے ہیں۔ میں اس سے قبل مجلس اتحاد المسلمین کے قائدین کی آمد کے موقع پر ان کا شاندار استقبال دیکھ چکا تھا۔ وہی کچھ نقشہ میرے ذہن میں تھا۔ میں یہ دیکھ کر محو حیرت رہ گیا کہ نماز جمعہ سے تقریباً ایک گھنٹہ قبل میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ ایک صاحب خوبصورت، خوش پوش، بلند قامت، گورا رنگ، چھریرا بدن، خوش وضع، سیاہ داڑھی، پر وجاہت شخصیت کے حامل سائیکل پر سوار میرے مکان کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہی وہ عظیم الشان قائد ہے جس کے آنے کا انتظار تھا۔ میں اس سادگی، خوش پوشی وخوش وضعی سے بہت متاثر ہوا اور ملنے کی خواہش دل میں پیدا ہوئی۔ بھائی خوان میں کھانا لایا اور ورانڈے کی بنچ پر ہی بیٹھ کر دونوں کھانا کھانے لگے۔ میں بھی پہنچ گیا اور سلام کرکے بیٹھ گیا اور موصوف سے جماعت کے متعلق گفتگو شروع کردی۔ مرحوم کے انداز تکلم اور تبسم چہرے نے دل موہ لیا۔ معلوم ہوا کہ کھانے کے فوراً بعد شہر سے

دو میل دور CANTONMENT میں موصوف خطبۂ جمعہ دیں گے۔ وہاں پیدل پہنچ کر خطبہ سنا۔ خطبہ کیا تھا دل کی آواز تھی۔ پہلی بار کسی ممبر سے اردو میں خطبہ سنا، دل کھنچ گیا۔ موصوف جیسے ہی باہر آئے لوگوں نے روک کر پوچھا آپ کس امام کے پیرو ہیں۔ آپؒ نے برجستہ فرمایا: "میں اماموں کے امام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو ہوں۔" لوگ PACK ہوگئے اور میں بھی نقد دل ہار بیٹھا۔ تفصیلی پروگرام معلوم کیا اور شرکت کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے فوراً اجازت دے دی۔ (بعد میں جب تعلقات بڑھے تو بتلایا کہ آپ نے پہلی ہی ملاقات میں یہ اندازہ لگالیا تھا کہ کام کا آدمی ہے۔ میں خود چاہتا تھا کہ آپ میرے دورے کے سارے پروگراموں میں شرکت کرکے تحریک کو سمجھیں) مختلف اوقات اور خطوں میں، مختلف مقامات پر مختلف طبقات کے چیدہ لوگ الگ الگ مدعو تھے۔ مثلاً وکلاء، محدود مذہبی تصور رکھنے والے لوگ، معززین شہر، طلبہ، غیر مسلم معززین۔ آپ ان سے مختصر اور جامع خطاب کرکے جماعت کا تعارف کرواتے اور سامعین کو سوالات اور اعتراضات کا موقع دے کر ان کے جوابات دیتے۔ اس طرح بغیر لٹریچر پڑھے میں ان محفلوں میں بڑی حد تک جماعت کی دعوت اور طریقۂ کار وغیرہ سے متعارف اور متاثر ہوگیا۔ موصوف سخت سے سخت اعتراضات اور اشتعال انگیز سوالات کو بھی بڑے تحمل سے سنتے اور بہت احسن انداز میں انکی تفہیم کرتے۔

اسی طرح شہر اورنگ آباد میں ایک دس روزہ تربیت گاہ کھولی گئی تھی جس میں اطراف واکناف کے رفقاء (ہمدرد اور امیدوار ارکان) شریک تھے۔ رفقاء کی ہمہ جہتی تربیت کا پروگرام موصوف نے خود اپنی نگرانی میں چلایا اور متذکرہ اول گروپس کے افراد کو روزانہ ایک ایک گروپ کو بلاکر ہم لوگوں کی موجودگی میں تعارفی تقریر کرکے ان کو سوال کرنے کا موقع دیتے اور خود جواب دیتے۔ اسی طرح اہل رفقاء کو بھی تعارفی تقریر کرنے کا موقع دیتے۔ ان دنوں ہم نے ایک والی بال میچ بھی کھیلا۔ موصوف اچھے SPORTS MAN

تھے۔ وال بال، ہائی جمپ اور لانگ جمپ میں اچھا درک رکھتے تھے۔ دوروں کے موقع پر دیگر ٹھوس پروگراموں کے علاوہ کھیل کود، اسپورٹس اور شعر و سخن کے پروگرام بھی رکھے جاتے۔ جس کے نتیجہ میں متنوع ذوق کے ذہین اور فعال نوجوان تحریک سے جڑتے تھے۔

موصوف کے دوروں کا ابتدائی طرز یہ تھا کہ شیروانی پر فوجی پوچ (POUCH) پہنتے اور اس کے دونوں جیبوں میں بھی اپنی ضرورت کا سامان انتہائی سلیقہ سے جما کر رکھتے (حتی کہ سوئی دھاگہ تک) سوٹ کیس میں کپڑے اور ہولڈال میں بستر بہت صاف ستھرا اور جما کر رکھتے اور ضروری لٹریچر برائے فروخت ہمیشہ دوروں میں ساتھ رکھتے کیونکہ ان دنوں مقامی مکتبوں کا وجود نہ تھا۔

چھوٹے چھوٹے اجتماعات کے موقع پر آتے تو اولین فرصت میں اجتماع گاہ کے سارے انتظامات کا معائنہ کر کے جائزہ لیتے اور مفید مشورے دیتے چونکہ انگریز کے دور کی فوج میں رہ چکے تھے اس لیے سب سے پہلے بیت الخلاء کے نظم کا معائنہ کرتے۔

تحائف قبول کرنے میں بہت محتاط اور نظم کے معاملہ میں سخت گیر تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں میں نے تحفہ پیش کیا تو بڑی قیل وقال کے بعد قبول کیا۔

دورے میں مسلم و غیر مسلم معززین شہر سے پابندی سے ملاقاتیں کرتے۔ دوروں میں باصلاحیت رفقاء کو ساتھ لے کر ان سے کام کروا کر مشورے دے کر عملی تربیت کرتے۔ جس شخص یا خاندان سے ایک بار تعلقات استوار کرتے، اسے آخری وقت تک نبھاتے اور فرد خاندان کی طرح بے تکلف ہو جاتے۔

مجھے اور میری اہلیہ کو موصوف ہی نے جماعت سے متعارف کرایا اور رکن کے قابل بنایا، جب ۱۹۷۵ء میں رفقاء کی تیسری قسط کی گرفتاری عمل میں آئی تو آپ کو عارضی کل ہند امیر بنایا گیا اور مجھے اپنے حلقہ کے ایک حصہ (مرہٹواڑہ اور ودربھ) کا قیم اعلیٰ مقرر

(بقیہ صفحہ ۱۳۰ پر)

مسلمانوں کا کوئی سیاسی موقف نہیں ہے

کیرلا میں لیگی بن جاتے ہیں، میسور میں جا کر وہ کانگریس کو ووٹ دیتے ہیں اور مہاراشٹر میں کسی اور پارٹی کے سایہ تلے جمع ہوتے ہیں۔

مولانا سید حامد حسینؒ کی ایک اہم تقریر ——— ادارہ

بمبئی میں مقیم چند بھٹکلی نوجوانوں نے ایک دعوتی و تربیتی تحریک ادارہ تربیت اخوان کے نام سے منظم کی۔ وسعت پاکر نئی نسل نوجوانوں اور کالج کے طلبہ و طالبات میں اس کی سرگرمیاں پھیلنے لگیں اس کے تحت اسلامی لٹریچر کے اشاعت کا کام بھی نوائط زبان میں چل رہا ہے۔ شمس نرسری اسکول تین سے چھ سال کے بچوں کی مثالی تربیت گاہ بھٹکل، کرناٹک میں قائم ہے۔ نوائط برادری جسے عرف عام میں بھٹکلی کہا جاتا ہے ہندوستان اور بیرون ہند دور دراز علاقوں میں تجارت کے لئے آباد ہیں، ہر جگہ یہ لوگ اجتماعی نظم سے مستفید رہتے ہیں۔ پچھلے چند ماہ قبل مولانا سید حامد حسین صاحب اور مولانا فضل حسین صاحب دورۂ کیرالا کے موقع پر کالی کٹ تشریف لائے تھے۔ بھٹکل مسلم جماعت کی دعوت پر مولانا سید حامد حسین صاحب نے جماعت کے اجلاس میں شرکت کی۔ سکریٹری بھٹکل مسلم جماعت کیرالا نے اس وقت ایک اہم استفسار کیا "مسلمانوں کا کوئی سیاسی موقف نہیں ہے کیرلا میں لیگی بن جاتے ہیں، میسور میں جا کر کانگریس کو ووٹ دیتے ہیں۔ مہاراشٹر میں کسی اور پارٹی کے سائے تلے جمع ہوتے ہیں ایسی صورت میں آپ ہی رہنمائی کیجئے کہ مسلمانان ہند کو اپنے نصب العین کے مطابق کیا رول ادا کرنا چاہئے۔ اس سلسلے میں جو تفصیلی جواب فی البدیہہ سید صاحب نے دیا وہ ملاحظہ

ہو۔ خدا کرے یہ جواب مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول اور قابلِ عمل ہو۔

(کنوینر نامعلوم)

الحمد للہ، الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الامین وعلیٰ آلہ

واصحابہ الطیبین الیٰ یوم الدین!

برادرانِ اسلام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ، اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ اس نے مجھے اپنی زندگی میں ایک اور مرتبہ بھٹکل مسلمان بھائیوں کی انجمن کالج میں حاضر ہونے اور ان سے ملاقات کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔ اس سے پہلے میں دو مرتبہ کالج میں حاضری دے چکا ہوں اور دونوں مرتبہ اپنے انھیں بھائیوں کے سامنے جماعتِ اسلامی ہند کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے جماعت کے پیغام کو، اس کے پروگرام اور پالیسی کو مختلف شعبہ ہائے حیات میں اس کی جو ACTIVITIES ہیں ان کو پیش کر چکا ہوں۔ آج کی اس صحبت میں میں اس بنیادی سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں جو ابھی ابھی اپنی افتتاحی تقریر میں ہمارے محترم دوست نے آپ سب کی موجودگی میں کیا ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں کا کوئی سیاسی موقف نہیں ہے۔ کیرالا میں لیگی بن جاتے ہیں، میسور میں جا کر کانگریس کو ووٹ دیتے ہیں، مہاراشٹر میں کسی اور پارٹی کے سایہ تلے جمع ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ ہی رہنمائی کیجئے کہ امتِ مسلمہ ہند کو اپنے نصب العین کے مطابق کیا رول ادا کرنا چاہئے۔

حضرات قبل اس کے کہ میں اس سوال کا جواب دوں قرآن و سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں اور اسلامی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے ایک بنیادی حقیقت آپ کے ذہن نشین کرانا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ اس کے بغیر اس سوال کا جو جواب میں دوں گا اس کو سمجھنے میں آپ کو دشواری ہو سکتی ہے۔ ہم سب اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ اس ساری کائنات اور تمام مخلوقات کا خالق، مالک اور حاکم اللہ تعالیٰ ہے اس نے نہ صرف یہ کہ ہماری مادی ضروریات کی تکمیل کا پورا پورا انتظام کر دیا بلکہ اپنے تمام مخلوقات میں سے انسانی مخلوق کی رہنمائی کے لئے اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے واسطے اس کے اخلاق کی تعمیر، اس کے کردار کے فروغ اور اس کے معاشی حالات کی درستگی، اس کی سیاست اور زندگی کے مختلف شعبوں میں رہنمائی کے لئے مکمل ضابطہ حیات بھیجنے سے پہلے

وقتاً فوقتاً تدریج کے ہر دور میں ہر زمانے میں پیغمبروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہر پیغمبر جو اللہ کی طرف سے آیا اور جس قوم میں آیا اور جس طرح کے حالات میں آیا اور جس زمانے میں آیا اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر اللہ کی ہدایت کے تحت تعلیمات پیش کرتا رہا اور اس کی قوم کی زبان میں تعلیمات پیش کی جاتی رہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی بنیادی تعلیم بندگیٔ رب کی تعلیم تھی اور بندگیٔ رب کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہوش سنبھالنے سے لے کر مرتے دم تک اپنے فکر و خیال میں، اپنے اخلاق و معاملات میں، اپنی تہذیب و تمدن میں، اپنی تجارت و معیشت میں اور زندگی کے ہر گوشے میں اللہ کی ہدایات کی پیروی کی جائے:

"یٰاَیُّہَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ"

اے انسانو! اپنے رب کی بندگی اختیار کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور تم سے پہلے والوں کو پیدا کیا تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

یہ ایک بنیادی بات تھی جو ہر پیغمبر اپنی قوم کے سامنے پیش کرتا تھا اور جو لوگ اس کی دعوت کو قبول کر لیتے تھے، ان کو تین اصولوں کی بنیاد پر منظم کرتا تھا:

پہلا اصول تھا صالح قیادت

دوسرا اصول تھا صالح مامورین

تیسرا اصول تھا خدائی ہدایات بحیثیت کوڈ آف کنڈکٹ CODE OF CONDUCT قیادت اور مامورین کے درمیان۔

نبی اور رسول کی موجودگی میں اور کسی شخص کے صالح تر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ نبی خود ہی قائد ہوا کرتا ہے اور جو اس کے مامورین ہوتے ہیں اس کے ساتھی ہوتے ہیں اس کے پیرو ہوتے ہیں ان سب کی اصلاح و تربیت اور تزکیۂ نفس میں وہ لگا رہتا ہے ان سب کو ایک مثالی سوسائٹی میں تبدیل کر دیتا ہے اور یہ پورے مامورین جو اس کے صحابی اور حواری ہوتے ہیں اللہ کی ہدایات کے مطابق اس کی پیروی کیا کرتے ہیں لیکن اس وقت تمدنی حالات اتنے پیچیدہ نہیں ہوا کرتے تھے جیسے کہ دورِ جدید میں مگر بہر حال جیسے جیسے دنیا کی آبادی بڑھتی رہی حالات میں تغیر پیدا ہوتا رہا، تمدنی مسائل بھی پیدا ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے زمانے میں دنیا سابقہ ادوار کے مقابلے میں کافی ترقی کر چکی تھی اور اللہ تعالیٰ مختلف انبیاء کے ذریعہ بہت سی تعلیمات بھیج چکا تھا۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے۔ وہ جانتا تھا کہ تمدنی اعتبار سے جس کو Called MAN'S CREATED دنیا کی سوسائٹی اتنی وسیع ہو چکی ہے جب کہ دنیا کی بنیادی تعلیمات کی تکمیل کر دینی چاہئے چنانچہ اس نے قرآن کے ذریعہ حضور کے واسطے سے ان کی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی کے اندر پوری تعلیمات پیش کر دی اور الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا کہہ کر اس پر آخری مہر لگا دی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی اور قیادت میں آج سے ساڑھے چودہ سو سال قبل اسلامی ملت وجود میں آئی تھی۔ مسلمان طبقہ وجود میں نہیں آیا تھا، مسلمان فرقہ وجود میں نہیں آیا تھا، مسلمان گروہ وجود میں نہیں آیا تھا، مسلمان محض سیاسی تنظیم وجود میں نہیں آئی تھی، مسلمان فوجی جماعت وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ ایک مسلم امت ایک خیر امت ایک اسلامی اجتماعیت وجود میں آئی تھی اور ایک MICROSCOPIC MINORITY ایک ادنیٰ سی اقلیت کی حیثیت سے وجود میں آئی تھی مگر وہ ایک نظریاتی، ایک انقلابی، ایک اصلاحی، ایک تعلیمی، ایک بین الانسانی اور ایک اسلامی تنظیم وجود میں آئی تھی۔ اس تنظیم کے رہنما بنفس نفیس حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور اس تنظیم کے پہلے ممبر اور ارکان حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔ یہ تنظیم مملکت عرب میں ایک DYNAMIC FORCE تھی، ایک انقلابی طاقت تھی، ایک اصلاحی حکومت تھی، ایک تحریک تھی جو زندگی کے تمام گوشوں پر محیط تھی۔ آپ تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو کہیں یہ دکھائی نہیں دے گا کہ حضور نے کوئی سیاسی مشن ہی اپنے سامنے رکھا ہو، کہ حضور نے کوئی قومی تحریک ہی چلائی ہو، کہ حضور نے صرف معاشی مسائل کے لئے کوئی اقدام کیا ہو بلکہ آپ کی پوری اسلامی تحریک زندگی کے ہر شعبے، ہر بگاڑ اور درستگی اور تعمیر کے لئے ہے فرد کی تعمیر ہو یا سوسائٹی کی اصلاح کر اپنے وقت کی انتہائی ترقی یافتہ روشن اسٹیٹ کی تشکیل ہو تاکہ اس کے ذریعہ سے پورے سماج کے اندر ہر جگہ انصاف قائم کیا جا سکے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت پوری تحریک چلائی اور دیکھتے ہی دیکھتے وحشی عربوں کی زندگی نے صالح ترین اور پاکیزہ ترین انقلاب برپا ہی نہیں کر دیا بلکہ ایک مثالی نمونے کی عالمی حکومت مدینہ منورہ MINIATURE WORLD ISLAMIC GOVERNMENT میں قائم کر دی اور اس حکومت کو پورے اسلامی نظام کے غلبہ کا ذریعہ بنایا۔ قرآن میں بہت سی ایسی

تعزیری تعلیمات ہیں بہت سے ایسے کریمنل وغیرہ ہیں بہت سے ایسے اصول و ضوابط ہیں جو حکومت اور اقتدار کے بغیر سوسائٹی میں نافذ نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے حکومت اللہ کے پورے قوانین کے نفاذ کا ذریعہ بنتی ہے اور آپ نے یہ حکومت بنائی بھی اسلامی نظام کے غلبے کے لئے گویا آپ کی پوری جماعت جس کو ہم ملت اسلامیہ اور خیر امت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دین کے غلبے کے لئے، اللہ کے اقتدار کے لئے قرآنی قوانین کے نفاذ کے لئے وجود میں آئی تھی۔ اور یہ ہدایت قیامت تک کے لئے تمام مسلمانوں کو دے دی گئی۔ چنانچہ مختلف مقامات پر واضح انداز میں فرمایا گیا اطیعوا اللہ و رسولہ ان کنتم مومنین "اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو" یہ اطاعت بعض امور میں مقید نہیں بلکہ ہر شعبہ میں ہمہ گیر ہے اور جو شخص اپنے کو مومن کہتا ہے ہر وقت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند ہے۔ کہیں کہا گیا ہے:

"یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول"

(اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں اور کبھی آپس میں اختلاف ہو جائے تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو)

اس میں قیادت کا اصول بتا دیا گیا کہ حکومت اسلامیہ کی تاریخ کے ہر دور میں ہر ملک اور ہر زمانے میں اللہ اور اس کے رسول کے راستے پر چلنے والے اولی الامر کی اطاعت کرنی چاہئے۔ جن کے اندر ایمان کی حرارت ہو، جن میں اخلاق کی بلندی ہو جن میں سیرت کی اور کردار کی پاکیزگی ہو جنمیں تقویٰ کی پختگی ہو جو صاحب صلاحیت ہوں، جن کے اندر صالحیت پائی جاتی ہو، انتظامی قابلیت رکھتے ہوں، دنیا کے حالات سے باخبر ہوں جن کے اندر ایک حکومت کو چلانے کی قابلیت اور صلاحیت ہو اور جن میں سب سے بڑھ کر تقویٰ ہو، ایمان و کردار ہو، یہ بنیادی چیز ہے۔ قیامت تک کے لئے اصول بیان کر دیا گیا ہے فرمایا:

"ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم"

(تم میں بزرگ و برتر وہ ہے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔)

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیادت اسی اصول کی بنیاد پر یکے بعد دیگرے حضرت صدیق اکبر، فاروق اعظم اور دیگر خلفاء راشدین کے پاس آتی رہی ۔ اس وقت یہ نہیں دیکھا گیا کہ کون دولت مند ہے کون وجیہ شخصیت ہے، کون اعلیٰ خاندان کا ہے، کون زبردست خطیب و مقرر ہے، کون پیغمبر کی اولاد ہے صرف ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم اور یہ بات کہ اولی الامر ہونے کی صلاحیت کس کے اندر پائی جاتی ہے ۔ کون زیادہ سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اور اسی کے راستے پر چلتا ہے ۔ چنانچہ صدیق اکبر، فاروق اعظم اور دیگر خلفاء راشدین محض مسجد کے امام نہیں تھے محض منبر نبوی کے خطیب نہیں تھے، محض تعلیم و تعلم اور درس و تدریس ان کا کام نہیں تھا بلکہ وہ وقت واحد میں جج بھی تھے، کمانڈر بھی تھے اور اپنے وقت کے صدر / پریسیڈنٹ اور پرائم منسٹر بھی تھے اور ایک تحریک کے لیڈر بھی تھے ۔ یہ وجہ ہے کہ مٹھی بھر جماعت جو مختصر سی امت MICROSCOPIC MINORITY جو لاکھوں عربوں کے درمیان تھی دنیا پر بھاری تھی ۔ دنیا میں عزت و وقار کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی، زمین فخر سے کہتی تھی کہ آج میرے سینے پر اللہ کے راستے کے سپاہی سوار ہیں اس وقت روم و ایران کی بڑی بڑی طاقتیں ان کے دبدبے سے، ان کی سادگی سے، ان کے کردار سے متاثر و مرعوب رہا کرتی تھیں ۔ اس وقت کی روم و ایران کی طاقتیں آج کے دور کی سپر پاور طاقتیں امریکہ اور روس کی طرح سپر پاور تھیں ۔ اس وقت بھی ایک پارلیمنٹ موجود تھی ، اس وقت بھی ایک اسمبلی موجود تھی ۔ حضور کے زمانے میں اور بعد میں بھی اسمبلی اور پارلیمنٹ جس کا کام دار الندوہ تھا جہاں سرداران قریش اکٹھے ہو کر سماج کے مسائل حل کیا کرتے تھے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یا آپ کے صحابہ کرام نے کبھی اس دار الندوہ یا پارلیمنٹ کی ممبر شپ کے لئے کبھی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جاہلیت کی بنیاد پر قائم تھی، وہ غیر اسلامی تھی، اسلام کی بنیاد پر قائم نہیں تھی ۔ اس کا وجود اس لئے نہیں تھا کہ بندگان خدا کو اس وقت کے اہل شرک اور اہل بدعت کو خدا کی بندگی کی طرف دعوت دیا جائے ۔ وہ باطل کے پرستار تھے ۔ دار الندوہ اس وقت کی پارلیمنٹ تھی اس وقت کی اسمبلی تھی لیکن کسی کے پاس اس میں شرکت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ آج ہم دنیا میں کروڑہا کروڑ کی تعداد میں ہیں، سوا کروڑ سے زیادہ ہیں ۔ ہمارا جذباتی تعلق، ہمارا عقیدے کا تعلق، ہمارا مذہبی تعلق اور ہمارا دلی تعلق انھیں بزرگوں سے ہے جس خدا پر وہ ایمان رکھتے تھے، جس رسول کے وہ مومن تھے، جس کتاب پر ان کو یقین تھا، جس یوم آخرت

کے وہ قائل تھے ۔ ہم اس طرح ان تمام چیزوں کے مومن ہیں مگر حقیقت واقعہ بقول اقبال یہ ہے :

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

پھر جو خصوصیات ان میں تھیں ان میں سے ہر خصوصیت ہمارے اندر سے ختم ہو چکی ہے ۔ یہ ہے جوہری بنیادی زبردست فرق ۔ ان کی پہلی خصوصیت یہ تھی کہ جن حقائق پر ایمان رکھتے تھے ان کے تمام تقاضے دل و جان سے پورا کیا کرتے تھے کوئی چوں و چرا ان کے پاس نہیں تھا ۔ جو مقصد اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے متعین کر دیا تھا یعنی شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ ۔ پھر جو مقصد حضور کے ذریعہ سے متعین کر دیا گیا تھا ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے پیغمبر کو الہدیٰ اور دین حق یعنی اسلام دے کر بھیجا کہ اسی دین کو غالب کر دے ۔ ESTABLISH کر دے اسی دین اسلام کی بنیاد پر فرد کی تعمیر کرے ۔ سوسائٹی کو سنوارے ۔ اپنے وقت کی ترقی یافتہ ریاست کی تشکیل کرے اس کے مقابلے میں جتنے ادیان باطلہ ہیں ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ دے ۔ چاہے یہ کام خدا کی اس مخلوق کو جو اس کی ذات و صفات میں شرک کرتی ہے کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرتا ہو ۔ یہ مقصد ہر گھڑی ان بزرگوں کے سامنے رہتا ہے ۔ زندگی اور موت ، ان کا اٹھنا اور بیٹھنا ان کا سونا اور جاگنا ، ان کی صلاحیت اور طاقت ، ان کے کاروبار اور تجارت اور ہر ہر چیز اس کام کے لئے وقف تھی ۔ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین ۔ ہماری نماز، ہماری قربانیاں، ہماری زندگی اور ہماری موت صرف اللہ رب العالمین کے لئے ہے، وہ دن رات سعی و جہد میں لگے رہتے ۔ یہ ان کی دوسری خصوصیت تھی ۔

تیسری خصوصیت ان کے اندر اجتماعیت کی تھی وہی صالح قیادت، وہی صالح ماموریت وہی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا ضابطہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۔ بہترین کلام اللہ کا کلام ہے اور بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے ۔ اس طرح اسلامی اجتماعیت ان کے اندر پائی جاتی تھی ۔

چوتھی خصوصیت ان میں جذبۂ جہاد بھی تھا اور روحِ جہاد بھی۔ یہ جذبہ ان میں نہیں محض کہ بگڑے ہوئے کردار کے ساتھ قرآن و سنت اور اللہ و رسول کے لئے مرمٹیں بلکہ جہاد کے ساتھ روحِ جہاد بھی تھا۔ اپنے نفس کے خلاف بھی یہ مجاہد تھے، باطل نظریات کے خلاف بھی وہ جہاد کرتے تھے۔ وقت کے باطل نظام کو ڈھا دینے کے لئے بھی سعی و جہد میں لگے رہتے تھے۔ سماج میں جتنی خرابیاں پائی جاتی تھیں ان کے خلاف وہ جہاد کرتے تھے۔ ان کا جہاد ہمہ گیر تھا۔ روحِ جہاد اور جذبہ جہاد سے بھرپور تھے۔ مقصدِ جہاد ہر وقت ان کے پیشِ نظر رہا کرتا تھا اور اس کے لئے دن رات سرگرمِ عمل رہتے تھے۔ یہ ان کی چوتھی خصوصیت تھی۔ ایک ہم ہیں کہ تمام خوبیوں سے عاری ہیں الّا ان میں سے کوئی خصوصیت دنیا کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ کوئی اللہ کا قہر بلا وجہ نازل نہیں ہوتا۔ اللہ کا عذاب کسی نہ کسی وجہ سے اس ملت پر نازل ہوتا ہے جو اس کو ماننے والی تو ہوتی ہے مگر اس کے احکام کی خلاف ورزیاں کرتی ہے۔ آج ہماری حیثیت وہ نہیں ہے جو حضرات صحابہ کرام کی تھی۔ دنیا ان سے مرعوب تھی اور ان کی عزت کرتی تھی اور ان کا وقار تسلیم کرتی تھی۔ آج ہم دنیا میں کروڑہا کروڑ کی تعداد میں ہیں لیکن ذلیل ہیں خوار ہیں پریشان ہیں۔ ملک ہی میں نہیں ملک کے باہر بھی بلکہ اگر میں یہ کہوں تو اس سے زیادہ سچی کوئی حقیقت اور نہیں ہو سکتی اگرچہ مسلمانوں کو یہ بہت برا لگتا ہے کہ مسلمانانِ عالم خاص طور پر مسلمانانِ ہند مردہ لاش ہیں اگر مردہ لاش نہ ہوتے تو کبھی کمیونسٹ، کبھی کانگریس، کبھی جن سنگھی، کبھی سوشلسٹ، کبھی دنیا بھر کے جتنے سیاسی گدھ ہیں وہ تمام ہم پر ہم الیکشن کے موقع پر ٹوٹ نہ پڑتے اور نوچ نوچ کر جس کو جتنا گوشت مل جاتا ہے کر نہ جاتے۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ زندہ جانور، زندہ انسان پر کبھی ٹوٹ پڑا ہو؟ گدھ وہیں پر ٹوٹ پڑتا ہے، اسی کا گوشت نوچتا ہے جو لاش مردہ ہوتی ہے۔ ہم مردہ لاش ہیں جس جس گدھ میں جتنی طاقت ہے اتنا گوشت لے کر چلا جاتا ہے۔ اس تشبیہ سے شاید آپ یوں سمجھیں کہ ہمارے پاس کوئی آئیڈیالوجی یا نظریہ نہیں ہے جب کہ فی الحقیقت موجود ہے لیکن ہم اس کو اپنائے ہوئے نہیں ہیں۔ اس ملک میں کمیونسٹ پارٹی کمیونزم کے لئے جان و مال کی بازی لگا سکتی ہے۔ یہ پورے ملک میں، عوام کو، خواص کو، حکومت کو، پارلیمنٹ کو، جوڈیشری کو، غرض ہر چیز کو کمیونسٹ بنا دے۔ ملک میں اندرا کانگریس پوری قوت صرف کر سکتی ہے کہ سارے ملک کو سیکولر، مادہ پرست MATERIALIST اپنی پسند کا سوشلسٹ

بنا دے۔ اس ملک میں جن سنگھ سر دھڑ کی بازی لگا سکتی ہے کہ ہندستان کا ایک ایک رہنے والا قدیم تہذیب کا پرستار، اس کا عاشق اور اس کا علمبردار بن جائے۔ پوری حکومت اس رنگ میں رنگ جائے۔ اسی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ وہ زندہ انسان ہیں۔ کبھی مسلمان ان کو مردہ لاش سمجھ کر ان پر ٹوٹ نہیں پڑتے کہ لاؤ تم اپنا ووٹ ہمیں دے دو اور ہم پر اعتقاد کرو۔ ہم تم کو SOLUTION یعنی نجات کی طرف لے جانے والے ہیں۔ ہم تمہارے مسائل کو حل کرنے والے ہیں۔ تم ہم سب خدا کے بندے ہیں اس لئے ہم ٦ تم کو بندگیٔ رب کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر ہم میں زندگی ہوتی تو ہمارے سوچنے کا انداز یہ ہرگز نہ ہوتا کہ ہم کسی کی جیب میں جا کر پڑ جائیں بلکہ سوچنے کا انداز اس سے بالکل مختلف ہوتا۔ ہم پبلک اوپینین OPINION یعنی رائے عامہ کو اسلام کے حق میں کیسے MOBILIZE یعنی متحرک کریں۔ عوام کی رائے کو اسلام کے حق میں کیسے ہموار کریں۔ ملک میں اسلامی انقلاب لانے کے لئے اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں غیر مسلم بھائیوں میں بعض تاریخی اور سیاسی معاشی و سماجی وجوہ سے پھیلی ہوئی ہیں ان کو کیسے دور کریں۔ اب میں آپ کو واضح انداز میں کیوں کر بتانا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کے اندر انتخابی سیاست کے بارے میں کچھ نقاط نظر ہیں۔ ہر نقطۂ نظر کو آپ کے سامنے پیش کر کے اس کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں اور آپ سے ایک فیصلہ چاہتا ہوں کہ آپ کون سا نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کی ایک ٹولی اور گروہ جس میں علماء کرام یعنی جانشینانِ رسول بھی ہیں، مفسرینِ قرآن بھی ہیں، معلمینِ حدیث بھی ہیں۔ بڑے تجربہ کار مسلم سیاست داں بھی ہیں اور مرحومین میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن جیسی شخصیتیں بھی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وقت کی برسرِ اقتدار جماعت کانگریس کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں ورنہ غیر مسلموں کی عظیم اکثریت کے اس ملک میں مسلمانوں کی چھوٹی سی اقلیت کا رہنا دشوار ہو جائے گا۔ یہ ایک نقطۂ نظر ہے اور اسی پر برسوں سے مسلمانوں کی عظیم اکثریت عمل کر رہی ہے۔

پہلا اعتراض جو اس پر وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کانگریس خداوندی ہدایات کے غلبے کے لئے نہیں آئی۔ اس کے برعکس وہ ایک ایسے نظام کو غالب کرنا چاہتی ہے جو اسلام کے منافی ہے۔ اگر یہ بات صحیح نہ ہوتی تو UNIFORM CIVIL CODE کے نام سے پرسنل لاء کو ختم کرنے کی کوشش کیوں کی جاتی۔ سوشلزم چاہے وہ اندرا گاندھی کے اپنے تصور ہی کا ہو بہر حال اسلام نہیں ہے۔

وہ بندگیٔ رب نہیں ہے۔ کانگریس کا ہر فرد سیکولرزم کا مومن ہے اس کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ نہیں ہے اس کا کلمہ لا الٰہ الا سیکولرزم ہے یعنی نہیں ہے کوئی معبود، کوئی حاکم، کوئی خدا۔ مگر سیکولرزم و سوشلزم۔ یہ عقیدہ اور FAITH کا مسئلہ ہے۔

سیکولرزم کی اصطلاح بڑی عام ہے اس کو میں سمجھانا چاہتا ہوں سیکولرزم کا ایک تصور روس اور چین میں ہے دوسرا تصور امریکہ میں ہے اور تیسرا تصور ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔

روس اور چین اور دوسرے کمیونسٹ ممالک میں سیکولرزم کا مطلب یہ ہے کہ فرد کی تعمیر ہو یا سماج کا سدھار یا اسٹیٹ کی تشکیل، خدا کی ہدایات سے بے نیاز ہو کر ہو۔ اخلاقی اور روحانی اقدار کو ختم کر کے کی جائے۔

امریکہ میں سیکولرزم کا تصور یہ ہے کہ اسٹیٹ اور سماج کی تشکیل خدا کی ہدایات سے بے نیاز ہو کر کی جائے لیکن چونکہ ہر فرد خدا کو کسی نہ کسی شکل میں مانتا ہے اس لئے اس کو اجازت ہے کہ اس کی پرائیویٹ لائف میں مسجد کے اندر، خانقاہ کے اندر، چرچ کے اندر، گردوارے کے اندر کچھ دیر کے لئے اپنے خدا کو بھی شریک کر سکتا ہے۔ مگر اللہ کو انسانوں کی سماجی، معاشی اور سیاسی معاملات میں دخل دینے کا اختیار نہیں، یہ حق صرف انسانوں کو ہے اس کا مطلب کیا ہوا۔ اگر وقت کی پارلیمنٹ جس کے سو ممبر ہیں ان کے ۵۱ آدمی یہ بل پاس کر دیں یا رائے دے دیں کہ ہر لڑکی ہر لڑکے کے لئے بالکل جائز ہونی چاہئے تو یہ رائے قانون LAW OF THE LAND بن جائے گا اور اگر ۵۱ فی صدی آدمی یہ رائے دے دیں کہ شراب بہترین اور سود مند ہے تو یہ LAW OF THE LAND یعنی WILL OF THE LAND بن جائے اور اگر ۵۱ فی صدی یہ طے کر دیں کہ لاٹری (جوا) اوور نائٹ OVER NIGHT لکھ پتی بننے کا بہترین ذریعہ ہے یہ فیصلہ LAW OF THE LAND بن جائے چاہے خدا ان چیزوں کو حرام اور ناپسندیدہ چیز قرار دے۔ یہ امریکی سیکولرزم دین اور دنیا کی تفریق ہے۔

ہندوستانی سیکولرزم یہ ہے کہ چونکہ یہاں مذہب کے ماننے والے بہت سے گروہ ہیں اس لئے محدود دائرے میں مذہب پر عمل پیرا ہونے کی پوری آزادی بھی چاہئے مگر اسٹیٹ کی تعمیر میں خدائی ہدایات کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے۔ امریکہ، روس اور ہندوستان میں ایک چیز مشترک ہے کہ انسانی زندگی خواہ کتنی ہی ناقص اور خام کیوں نہ ہو خدائی احکام سے بالاتر، برتر اور طاقتور ہوا کرتی ہے۔ سماج

کو جس حد تک چاہے موڑ سکتی ہے۔ کانگریس ایک ایسی پارٹی ہے جو ہمارے بنیادی عقیدے اور مسلک سے ٹکراتی ہے، ہم کیسے ووٹ دے سکتے ہیں۔ کیا ہم، کیا آپ اللہ کے مقابلے شیطان کو ووٹ دینا پسند کریں گے؟ کیا اللہ کے رسول کے مقابلے میں کسی .... کو ووٹ دینے پر راضی ہوں گے؟ کیا یہ ایمان کا تقاضہ ہو سکتا ہے۔ جانے دیجئے تھوڑی دیر کے لئے یہ اعتراض نہیں وارد ہوتا۔ دوسرے پہلو سے دیکھئے کہ اسی کانگریس نے آزادی کے بعد سے اب تک بلا شرکت غیرے اس ملک پر حکمرانی کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ PARTY POWER کانگریس رہی ہے POLITICAL POWER کانگریس رہی ہے SYSTEM IN POWER کانگریس کا رہا ہے POLICY POWER کانگریس کی ہی رہی ہے۔ ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں ہے کہ مادی، اخلاقی اور روحانی طور سے ان ۲۵ برسوں کے اندر ملک کو کتنا فائدہ ہوا ہے ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو کیا فائدہ ہوا۔ سوائے اس کے کہ کچھ کانگریسی مسلمان ایم۔ پی۔ بن گئے کیبنٹ کے منسٹر بن گئے ان کا بھلا ہو گیا یا ان کے رشتہ داروں کی قسمت جاگ اٹھی بحیثیت مجموعی اسلام کو اور مسلمانوں کو کیا ملا؟ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ فراست ایمانی یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ سانپ کے بل میں انگلی ڈالنے سے سانپ ڈس لیتا ہے تو دوسری مرتبہ مومن کو اس سوراخ میں انگلی نہیں ڈالنی چاہئے۔ مسلمانوں نے بارہا کانگریس کے اس بل میں انگلی ڈالی جہاں سیکولرزم اور سوشلزم پر ناز ہے کیا آپ ابھی اور چاہتے ہیں کہ فراست ایمانی کے خلاف اسی کانگریسی بل میں پھر انگلی ڈال دیں۔ اگر کسی کے پاس اعمال صالحہ کا اثاثہ زاد راہ ہے تو ٹھیک ہے وہ کر سکتا ہے۔

مسلمانوں کا ایک دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کانگریس بری اور اپوزیشن پارٹی اچھی ہے، اس لئے اپوزیشن پارٹیوں کو، یا ان میں سے کسی ایک کو یا بہتوں کو ووٹ ڈالنا چاہئے تاکہ کوئی بھی ناراض نہ ہو سب کی ہمدردی حاصل رہے۔ آپ اپوزیشن پارٹیوں کو گن لیجئے اور تقسیم کیجئے تو دو ہی قسم کی اپوزیشن پارٹیاں ملیں گی۔ ایک نظریاتی یعنی IDEOLOGICAL، جیسے کمیونسٹ اور سوشلسٹ۔ دوسری NATIONAL جیسے جن سنگھ۔ کوئی تیسری قسم کی پارٹی نہیں ہے اس پر بھی سیاسی اعتبار سے وہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو کانگریس پر وارد ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء کے بعد ایک دور ایسا بھی گذرا ہے جب کہ مختلف صوبوں میں ان جماعتوں کی کولیشن COLLISION، گورنمنٹ قائم ہوئی

جو کانگریس کے علاوہ تھی۔ کیا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا سلوک ویسا ہی نہ تھا جیسا کہ کانگریسی حکومتوں کا رہا ہے۔ یہ بالکل یکساں ہیں کوئی فرق نہیں۔

پھر ذرا اس پہلو سے بھی سوچئے کہ جو شخصیتیں اور جو جماعتیں خدا بیزار ہوں، جن کے پاس آخرت کے حساب ہی کا کوئی تصور نہ ہو، جن کے نزدیک اخلاق کی کوئی مستقل اہمیت نہ ہو اور جب کہ بدکرداری کا مظاہرہ دن رات پارلیمنٹ کے اندر بھی کیا کرتے ہوں اور پارلیمنٹ کے باہر بھی کیا ان کے کسی قول و فعل پر کبھی اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اور کیا انھوں نے آج تک اپنے کسی ایک عہد کو بھی پورا کیا ہے؟ اگر نہیں تو پھر آپ اپنا ووٹ جو اللہ کی امانت ہے ان کو کیسے دے سکتے ہیں؟

ایک انداز نظر یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو خود سیاسی تنظیم بن جانا چاہئے۔ ایک جھنڈے تلے ایک پلیٹ فارم پر مجتمع ہو جانا چاہئے اور اپنے حقوق و مطالبات کے لئے اور اپنے مفادات و طاقت کے لئے سیاست یعنی الیکشن اور پالٹکس میں حصہ لینا چاہئے اور اسی کو ذریعہ بنانا چاہئے۔ ہم کسی کو ووٹ نہ دیں بلکہ صرف اپنی تنظیم ہی کو ووٹ دیں۔ بڑی وزنی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس حد تک معقول تو ضرور ہے کہ جمہوری ملک میں ہر شخص، ہر تہذیبی گروہ اور ہر یونٹ کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے منظم ہو اور اسی کے لئے سیاسی اور غیر سیاسی طریقے اختیار کرے۔ لیکن دو باتیں سوچنے کی ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ کیا اسلام صرف سیاست ہے کہ مسلمانوں کو صرف سیاسی تنظیم بن جانا چاہئے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میرا اور آپ کا ایمان یہ ہے کہ سیاست صرف اسلام کا جز ہے سیاست کل نہیں ہے۔ اس لئے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی تنظیم بننا اور اسلام کے لئے سیاست کو اپنانا ٹھیک ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ حالات کا تقاضہ - PRACTICAL WISDOM یعنی حکمت عملی کا مطالبہ یہ ہے کہ دین کے بقیہ گوشوں کو ہم دوسروں کے حوالے کر دیں اور محض سیاسی مفاد کے لئے سیاسی طور پر منظم ہو جائیں تو پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمان اس وقت اس پوزیشن میں ہیں کہ کسی ایک لیڈر یا اجتماعی قیادت COLLECTIVE LEADERSHIP کے تحت رہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسلم مجلس مشاورت کی بعض جماعتیں جو بنیادی اکائیاں CONSTITUENT UNITS ہیں جو اپنی جماعتی حیثیت سے موجود ہیں مگر ساری کوششوں کے باوجود ہزاروں [illegible] خود جنوبی ہندوستان میں کیرالا، مدراس، کرناٹک

میں مسلم مجلس مشاورت کا وجود تک نہیں ہے، چونکہ اس کے وجود کا معنی ان علاقوں کی مسلم سیاسی تنظیموں کی اپنی موت ہے لیکن ملت ہر سیاسی تنظیم سے بالاتر ہے۔ اگر ہر سیاسی تنظیم اپنے آپ کو ملت سے بالاتر سمجھے اور ملت اس کو اسلام سے بالاتر سمجھے اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے تھوڑی دیر کے لئے مان لیتا ہوں کہ سارے مسلمانان ہند ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے کتنی خوشی کی بات ہے لیکن ہندوستان میں جو طریقہ انتخاب ہے۔ JOINT ELECTORATE SYSTEM اس میں کتنی CONSTITUENCIES ہیں جہاں مسلمانوں کی MAJORITY ہے کہ مسلمان تنظیم کسی طرح سے اپنے امیدواروں کو کامیاب بنا سکے۔ آپ کے سامنے پچھلے ۲۵ سالوں کا تجربہ ہے مگر اس کو بھی مان لیتا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی جتنی آبادی ہے وہ اس مسلم تنظیم کے ذریعے اپنے نمائندے پارلیمنٹ اور اسمبلی میں بھیج دے۔ ایک انہونی چیز میں مان لیتا ہوں۔ آپ کا کتنا پرسنٹیج ہے۔ ۱۰ سے ۱۲ فی صد پارلیمنٹ اور اسمبلی میں آپ کے ۱۲ فی صدی نہیں بلکہ ۱۵٪ منتخب بھی ہو گئے، کسی پارلیمنٹ اور اسمبلی میں کوئی پارٹی ایسی نہیں ہے جو اسلام دشمن نہ ہو اور بعض وجوہ سے پاکستان بن جانے کی وجہ سے مسلمانوں پر اعتماد نہیں کرتے۔ ایسی صورت میں آپ کے ۱۵ فیصدی آدمی جس بات کے لئے بھی مسلمانوں کی تہذیب، یونیورسٹی، اور اردو، جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے کوئی قانونی کوشش کریں گے کیا آپ کا کوئی بل بن سکے گا؟ اور جب قانون بن جائے گا تو کیا آپ کے لئے مفید ہوگا؟ مان لیجئے کہ بمشکل بھی مل گئے اور قانون بھی بن گیا لیکن جو بیوروکریسی اور ایڈمنسٹریشن ہے جس کے دل و دماغ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر بھرا ہوا ہے وہ کسی قانون کو نافذ بھی کر سکتی ہے؟ سینکڑوں قوانین بن کے موجود ہیں جن میں سے بعض تو ان کے مفاد کے لئے ہیں۔ UNTOUCHABILITY ایک قانون ہے ANTICORRUPTION LAW دوسرا قانون ہے ANTI HOARDING LAW کتنے ہی قوانین ہیں۔ کیا خود عوام کی بھلائی کیلئے ایک قانون بھی نافذ ہو پاتا ہے؟ ان حالات میں ایک ایسی پارلیمنٹ میں جہاں حق و ناحق کی اساس پر فیصلے نہیں ہوا کرتے۔ ۵۱ فی صد بیوقوفوں کی رائے ۴۹٪ عقل مندوں کی رائے کے مقابلے میں وزنی ہو جاتی ہے۔ جہاں پارٹی ہوپ PARTY WHIP کہہ دے کہ ہاتھ اٹھاؤ چاہے ضمیر گوارا کرتا ہو یا نہ کرتا ہو ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے۔ ایک ایسی جمہوریت کے اندر جمہوریت نہیں ہے بلکہ اکثریت ہے جمہوریت کا مذاق ہے اور جب ماری کی ڈنڈا گیری ہے تو آپ کیا کر سکتے ہیں۔ آپ کیرالا والے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنے

خالص سوچ، رپاؤ اور اثر کی وجہ سے کولیشن گورنمنٹ بنائی اور دیکھئے کالی کٹ کی یونیورسٹی قائم کردی ملاپورم ڈسٹرکٹ قائم کردیا۔ بڑی وزنی بات معلوم ہوتی ہے مگر مجھے یہ تو بتائیے کہ کالی کٹ یونیورسٹی اور بنارس یونیورسٹی میں نظام تعلیم کے لحاظ سے کیا جوہری فرق ہے؟ صرف سماجی پڑھا دینا، صرف عربی پڑھا دینا اسلامی نظام تو نہیں ہے۔ باقیات و سائنسز اور جتنے علوم و فنون ہیں سب وہی ہیں جو بنارس یونیورسٹی کے ہیں اور جو کیرکٹر کسی بھی نیشنل یونیورسٹی کے طالب علموں کا بنتا ہے وہ یہاں بھی بنتا ہے۔ اگر عربی پڑھا دینا کوئی بڑی بات ہوتی تو کیا مصر میں سارے لوگ عربی نہیں جانتے؟ مگر کیا مصریوں کے پاس اسلامی کردار ہے؟ کیا شام کے لوگ عربی نہیں جانتے؟ لیکن کیا ان میں اسلامی کردار ہیں؟ کیا آپ لوگ یو۔پی کے مسلمانوں سے زیادہ اردو جانتے ہیں؟ اس گئی گذری حالت میں بھی یو۔پی۔ کا مسلمان فصیح و بلیغ اردو بولتا ہے۔ کیا محض اردو جاننے اور اس کے تحفظ کی وجہ سے اسلام پیدا ہو جاتا ہے؟ اسلام کے پیدا ہونے کی بات تو بالکل دوسری ہے۔ ملاپورم ضلع بن گیا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت - MAJORITY ہے لیکن کیا یہاں ایڈمنسٹریٹر، کلکٹر اور باقی تمام کارندوں کا مسلمان ہونا بھی ضروری ہوگا؟ جب گورنمنٹ بنے گی اور اس کی جو پالیسی ہوگی ویسے ہی گورنر اور ایڈمنسٹریٹر بنیں گے، جو قوانین ہوں گے سب کے لئے ہوں گے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر ناز کیا جائے۔ آپ کمال سمجھتے ہیں تو بھی کس قیمت پر؟ کابینہ میں شراب حلال کی جاری ہو اور اس پر تنظیم کے دستخط بھی ہوں کیا شراب حلال ہے؟ ایک حرام شئے کو حلال کر کے دو ایک چیزیں اگر ایسی حاصل بھی ہو جائیں تو اس کو کریڈٹ نہیں کہتے۔ یہ تو سراسر آخرت کا نقصان ہے۔ ہاں یہاں اگر اسلامی اسٹیٹ قائم ہو گئی ہوتی تو کہا جا سکتا تھا کہ واقعی مسلم سیاست سے ایک عظیم فائدہ حاصل ہوا ہے۔

آپ کے نزدیک یہ سوال ہے کہ تب ہم کیا کریں؟ اس ملک میں ہمارے ذاتی تحفظ اور ہندوستان کی بہبودی کے لئے ہم کیا بااثر رول ادا کر سکتے ہیں؟ سمجھائیو! آئیے میں آپ کو مسائل کا حل بھی بتاتا ہوں۔ افسوس کا مقام ہے مسلمان اس حل کے لئے بھی تیار نہیں۔ آپ سب سے پہلے اردو زبان کو لیجئے۔ مان لیجئے کہ شریمتی اندرا گاندھی ایک سرکاری آرڈیننس کے ذریعہ اردو کو سارے ملک میں COMPULSARY اور لازمی زبان قرار دے دیں دوسری سرکاری زبان بنادیں لیکن جب مدرسوں اور طالب علموں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ان کا معاشی مستقبل REGIONAL LANGUAGE علاقائی

زبانوں اور ہندی اور انگریزی سے وابستہ ہے تو اردو کو خود طلاق دے دیں گے۔ نہیں پڑھیں گے یہ تو نہیں ہوگا کہ اردو کو دوسری اور سرکاری زبان قرار دینے سے ہندی اور انگریزی ختم کردی جائیں۔ ان حالات میں اردو کون پڑھے گا۔ یو۔پی۔ میں سمپورنانند منسٹری نے کچھ فیگر چھوڑا! کچھ سہولت دی لیکن لڑکے آتے ہیں تو استاد نہیں ملتے اور استاد ملتے ہیں تو لڑکے بھاگ جاتے ہیں۔ کتابیں نہیں ہیں۔ اس کے برعکس آپ نے اردو کا مسئلہ حل کر لیا۔ تاریخ کے مسلمان حل کر رہے ہیں، کیرلا کے مسلمان حل کر رہے ہیں۔ میں جن برادریوں کا ذکر کر رہا ہوں وہ عربی النسل ہیں ان کو دین سے گہری وابستگی ہے ان میں دین کی حرارت ہے ان کو مذہب سے لگاؤ ہے اور وہ جانتے ہیں کہ عربی زبان کے بعد دین اسلام کا سب سے زیادہ ذخیرہ اردو میں ہے۔ اس لئے ایمان کی حرارت ان کو مجبور کرتی ہے کہ اردو زبان سیکھیں، اپنے بچوں کو پڑھائیں۔ ۱۹۵۵ء میں جب میں پہلی بار کیرلا آیا تو اس وقت کیرلا والوں سے یا تو انگریزی میں بات کر سکتا تھا یا پھر ع

آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو گئے

تم ہمارے ہم تمہارے ہو گئے

میں انگریزی نہیں جانتا تھا، ملیالم نہیں جانتا تھا۔ آج وہی کیرلا ہے جہاں کتنے ہی نوجوان اردو سمجھتے ہیں میری تقریر کی ترجمانی بھی کر لیتے ہیں۔ حالانکہ میں بہت آسان زبان نہیں بولتا۔ بسا اوقات اونچی زبان بولتا ہوں لیکن یہ دیکھ کر بولتا ہوں کہ میرا ترجمان کون ہے۔ ٹی۔کے۔ عبداللہ میرا ترجمان ہوتا ہے تو میں اونچی زبان بولتا ہوں کیونکہ وہ کیرلا کا باشندہ ہونے کے باوجود اردو کا زبردست ادیب ہے۔ اور ترجمان ہوتے ہیں تو میں آسان اردو بولتا ہوں۔ ان لوگوں نے اردو کیوں سیکھی؟ کیا اردو سے ان کا معاشی مستقبل وابستہ ہے کچھ بھی نہیں۔ انھوں نے اردو زبان صرف دین کے خاطر سیکھی۔ نارتھ ارکاٹ ڈسٹرکٹ میں جتنے لبا ہیں وہ اردو بولتے ہیں۔ آپ وانمباڑی چلے جائیے وہاں اسلامیہ کالج ہے وہاں اسلامیہ گرلس اسکول ہے جہاں ہزار لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ وہاں اسلامیہ ہائی اسکول میں آپ میرے ساتھ چل کر دیکھئے وہاں طلبا اردو پڑھ رہے ہیں آخر یہ لوگ کیوں سیکھ رہے ہیں جب کہ ان کی زبان تمل ہے؟ وہ عربی انگریزی اور تمل سیکھتے ہیں اور سب کے سب اردو بولتے ہیں۔ دینی تحریک بنتی ہے تو ایسے ہی خوشگوار نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اگر یہ فیصلہ کر لیں کہ ہمیں ہر صورت میں مسلم بن کر رہنا ہے اور اپنے بچوں کو مرد مومن بنانا ہے تو چاہے اردو ملک میں نافذ نہ ہو اردو سیکھیں گے، اخبارات نکالیں گے، پرچے پڑھیں گے۔

آپ کے بھٹکل امر عربی یونیورسٹی میں بے شمار اردو پرچے آتے ہیں۔ دعوت، ندائے ملت، صدق جدید، تجدید، الحسنات، حجاب اور معلوم نہیں کتنے پرچے آتے ہیں۔ آپ کو ان کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کونکنی بولتے ہیں، مرٹی بولتے ہیں۔ آپ کو اردو کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ہیں آپ کی دینی ضرورت ہے۔ آپ نے بھٹکل میں جامعہ اسلامیہ کیوں قائم کردیا صرف اس لئے کہ آپ کی دینی ضرورت تھی۔ آپ نے اپنے کالج میں اسلام کی داعی شخصیت کو پرنسپل کیوں بنایا یا مولانا ابوالحسن علی ندوی کی سفارش پر جامعہ اسلامیہ کو جماعت اسلامی ہند کے مولانا شہباز محمد کے زیر انتظام کردیا اس لئے کہ آپ کو اسلام عزیز ہے، اور دین متین کی تڑپ ہے جو آپ کو ان اقدامات پر آمادہ کرتی ہے۔ اردو کے مسئلہ کا حل وہ نہیں ہے جو سیاسی جماعتیں کرتی ہیں۔ اس کا حل وہ ہے جو آپ نے کیا۔ وہ تو سیاسی اسٹینڈ ہے۔

آئیے پرسنل لا کو لیجئے۔ آپ اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ بمبئی میں بڑے پیمانے پر آل انڈیا کنونشن منعقد ہوا تھا۔ اس کنونشن میں کوئی دو لاکھ آدمیوں سے میں نے خطاب کیا تھا۔ اس موقع پر ایک پرسنل لا بورڈ بھی تشکیل دیا گیا تھا۔ سوچنے کی چیز یہ ہے کہ پرسنل لا کا مسئلہ کیوں پیدا ہوا۔ اسلام کے قانون نکاح وطلاق اور اسلام کے قانون وراثت کا نام پرسنل لا ہے۔ چونکہ ہم خود بھی مسلم پرسنل لا پر عمل پیرا نہیں ہیں اس لئے مسلم سماج میں طرح طرح کی بے انصافیاں پائی جاتی ہیں اور اس بنا پر حکومت وقت بلاوجہ انصاف کے قیام کی ذمہ دار ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ اس قانون کی کوئی خرابی ہے کہ وراثت اور طلاق کے سلسلے میں وارثوں میں جھگڑے آتے رہتے ہیں۔ اس کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم حکومت سے لڑیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہم قانون نکاح وطلاق پر عمل کرنے لگیں۔ ایک مثال دیتا ہوں۔ مسلمانوں میں ایک شخص مرتا ہے۔ قانون وراثت کے مطابق اس کی جائیداد اس کے ورثا میں تقسیم ہو جانی چاہئے۔ مگر بالعموم وہ تقسیم نہیں ہوتی۔ ایک شخص اپنی بیوی سے ناراض ہوگیا۔ اسلام میں طلاق دینے کا یہ طریقہ ہے کہ طہر اور پاکیزگی کی حالت میں ایک طلاق دے دے۔ پھر اللہ اس کو ایک مہینہ کی مہلت دیتا ہے کہ غور کرو۔ ممکن ہے کہ جذبات اور غصہ میں طلاق دے دی ہو۔ بیوی کو اپنے گھر میں رکھو۔ اس کی دیکھ بھال کرو۔ اس کو جانے نہ دو۔ شاید مصالحت ہو جائے۔ پھر بھی اگر یہی فیصلہ ہے کہ طلاق دینا ہے تو دوسری پاکیزگی کی حالت میں دوسری طلاق دو۔ ایک دم نہ دو۔ اب پھر ایک مہینہ کی مہلت ہے اس میں بھی اگر اتفاق کا [illegible] ہو جائے تو [illegible] نکاح کر [illegible] دوسروں سے نہیں لیکن اس [illegible] میں:

بھی مصالحت نہیں ہوئی تو اللہ کی طرف سے وارننگ ہے کہ یاد رکھو جب تیسری مرتبہ طلاق دو گے تو عورت طلاق مغلظہ کے نتیجے میں نکل جائے گی پھر پچھتاؤ گے اور چاہو گے بھی کہ نکاح کر لو تو نکاح اس وقت تک ممکن نہ ہوگا جب تک کہ اس کا نکاح کسی اور سے نہ ہو جائے اور فی الواقع کسی معقول وجہ سے وہاں بھی طلاق نہ ہو جائے حلالہ کرنے کے لئے صرف ایک رات یا دو رات کا مسئلہ نہیں ہے۔ واقعتاً جب تک یہ صورت نہ پیدا ہو جائے اس وقت تک تم کو نہیں ملے گی۔ یہ اتنی زبردست پھٹکار ہے کہ آدمی سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور یہ طریقہ طلاق نہیں کہ مسلمان کو غصہ آیا اور جھٹ سے کہہ دیا کہ میں نے تجھے تین طلاق دی۔ طلاق، طلاق، طلاق۔ زندگی برباد ہوگئی۔ یہ پرسنل لا کا قصور ہے یا ہمارا قصور ہے۔ حکومت اس کا حل کیا ڈھونڈے۔ اس کا حل تو صرف ہمارے ہی پاس ہے۔

________ سب اس کے ہمدرد ہوں گے اور میں بھی اس کا ہمدرد ہوں۔ لیکن ہمدردی ہمدردی میں فرق ہے۔ اسلامی یونیورسٹی اس یونیورسٹی کو کہتے ہیں جس کا نصب العین اسلام ہو جس کا نظام تعلیم اسلامی ہو۔ جہاں کے وائس چانسلر اور اساتذہ میں اسلام سے عقیدت ہو اور ان کا کردار اسلامی تعلیمات کا آئینہ دار ہو۔ جہاں کا ماحول اسلامی ہو۔ آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں جاکر دیکھئے وہاں کیا چیز آپ کو اسلامی نظر آتی ہے۔ ایک زمانہ تھا وہاں کے طلبہ کالی شیروانیوں میں ملبوس رہتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ ایک اعلیٰ قسم کی قوم وہاں رہتی اور بستی ہے۔ سمجھا جاتا تھا کہ ایک جدید طرز کی مسلم ملت ہے لیکن اس کا نام تو اسلام ہے نہیں۔ کیا مسلم یونیورسٹی سے دہریے نہیں نکلتے ہیں۔ ایک ایسی یونیورسٹی جو چوں چوں کا مربہ ہو اسلامی کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ مسلم یونیورسٹی ہے مسلمانوں کی۔ جیسے ہندو یونیورسٹی ہے ہندوؤں کی۔ میری ہمدردی کا رخ یہ ہے کہ میں اس کو اسلامی بناؤں اگر آپ میں دم خم ہے حوصلہ ہے تو اس میں انقلاب لائیے۔ میرا سوچنے کا انداز اس عام انداز سے مختلف ہے۔ اس کا حل یہ نہیں ہے کہ ۱۹۲۰ء کا ایکٹ واپس لایا جائے۔ سپریم کورٹ نے جو بھی فیصلہ دے دیا ہے اگر یہ فیصلہ صادر ہوتا کہ ۱۹۲۰ء کا ایکٹ ہی لاگو رہنا چاہئے تو کیا یونیورسٹی کے اندر راتوں رات overnight کوئی تبدیلی آجاتی۔ اس میں تبدیلی لانے کے لئے وہاں کا فکر وشوق بدلنا ہوگا۔

اب میں معاش کے مسئلہ کو لیتا ہوں۔ مثال کے طور پر آپ کی چھوٹی سی لوکل برادری ہے۔ فرض کیجئے

کی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی بھی آپ پر فرض ہے۔ آپ میں جتنے صاحبِ نصاب لوگ ہیں، اپنی تجارت، اپنے بینک بیلنس، زراعت اور سونے اور چاندی کی زکوٰۃ نکالیں اور ایک بیت المال قائم کرکے اس میں داخل کردیں۔ شادی بیاہ، پیدائش سے لے کر موت تک آپ جو بے شمار غیر شرعی خرچ کرتے ہیں اس کو ایک لخت روک دیں اور وہ بیت المال میں جمع کردیں۔ آپ کے نوجوان جو سنیما دیکھا کرتے ہیں جو فحش اور جاسوسی ناولیں پڑھتے ہیں اور جن کے ساتھ ٹرانسسٹر ریڈیو صرف سیلون کے گانے سننے کے لئے ہوا کرتا ہے جس سے اخلاق تو خراب ہوسکتے ہیں معاشی فلاح ممکن نہیں ہے۔ ان تمام اخراجات کو بچا کر بھی آپ روپیہ جمع کرسکتے ہیں۔ پھر کتنی ایسی تقریبات ہیں جن کا اسلام سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے جب شب برات یا بارہ وفات کی ہے تو مسلمان کروڑہا کروڑ روپے آگ کی نذر کردیتے ہیں۔ اللہ کے پاس باز پرس تو ہوگی فائدہ کچھ بھی نہیں۔ اس سے اجتناب کیجئے۔

پھر آپ قانونِ وراثت پر چلئے جو محروم ہیں اور ساتھ ہی صلاحیت بھی رکھتے ہیں تو اگر ان کی دولت ان کو وقت پر مل گئی تو CIRCULATION OF WEALTH سے دولت ہی تو بڑھے گی۔ اس طرح آپ کا بیت المال بڑا ہوسکتا ہے لاکھوں اور کروڑوں کی آمدنی ہوسکتی ہے۔ آپ اسکیمیں بنائیے، انڈسٹریل کالج کھولئے، انڈسٹری ہوم قائم کیجئے، بلا سودی قرضے جاری کیجئے، بیج گودام قائم کیجئے اور کسانوں کو بلا سود کے بیج فراہم کیجئے اور ان کو قرضِ حسنہ دیجئے۔ لوگوں کو کاروبار پر لگائیے۔ بیواؤں کی معاشی فلاح کا انتظام کیجئے۔ اس بات کا خاص خیال رکھئے کہ خازن اور نگران ایماندار ہونا چاہئے۔ آپ دیکھتے ہی دیکھتے اس چینل CHANNEL سے مسلمانوں کی معاشی بدحالی دور کرسکتے ہیں۔

آج مسلمان کیا چاہتا ہے؟ وہ قارون اور برلا کی دولت چاہتا ہے، نظام اور راک فیلر کی دولت چاہتا ہے تاکہ اس کے بگڑے ہوئے اطوار برقرار رہیں اور وہ دولت پاتا رہے، اپنے بے جا خواہشات کی تکمیل کے لئے اس کو پیسہ ملتا رہے۔ مولانا حالی نے کتنی بڑی بات کہی ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم ـــ ہمارے مسائل کا حل ہمارے پاس ہے۔ پارلیمنٹ یا اسمبلیوں کے پاس [illegible] نہیں، صرف اس صورت میں ہے جب کہ آپ رائے عامہ کو اسلام

کے بارے میں ہموار کردیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اس کو دور کردیں تو اس پوزیشن میں آجائیں کہ آپ ۵۱٪ اکثریت 51% MAJORITY - ۴۹٪ اقلیت 49% MINORITY میں اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں جا سکیں تو آپ کی بات میں وقار ہوگا آپ اپنی مرضی اور قانون بنانے کے لئے دوسروں کو بھی ہموار کرسکیں گے۔ آپ کی بات وزنی ہوگی۔ آپ بکاؤ مال تو نہیں ہوں گے۔ آپ تیاری تو کیجئے۔

رہ گیا ووٹ کا معاملہ تو میں صرف آپ سے اتنا ہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ گوپالن سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ باجپئی کو ووٹ دے گا؟ کیوں صاحب کیا خیال ہے آپ کا۔ ایک کمیونسٹ، جو کمیونزم کا پکا مومن ہو وہ کبھی باجپئی اور ڈالمیا کو ووٹ نہیں دے سکتا۔ کیا آپ ابراہیم سلیمان سیٹھ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ جن سنگھ کے لیڈر باجپئی کو ووٹ دیں گے؟ یہ ممکن نہیں ہے۔ کیا آپ اندرا گاندھی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ نجلنگپا کانگریس (او) کو بالخصوص مرارجی ڈیسائی کو ووٹ دیں گی؟ یہ ناممکن ہے۔ ہر آدمی جو جس نظریہ کا مومن ہوتا ہے وہ اپنے نظریہ کے ضد نظریہ والے کو ووٹ نہیں دے سکتا۔ اس کے سامنے یہ سوال ہی نہیں اٹھتا کہ وہ کس کو ووٹ دے بلکہ اس کے سامنے یہ سوال ہوتا ہے کہ کس طرح دوسروں کے ووٹ اپنے حق میں ہموار کرے۔ اس کے بالکل برعکس ہمارا سوال یہ ہے کہ ہم اپنا ووٹ کس کو دیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم پر مرحوم نہیں ایک موت پہلے ان کی بھی واقع ہوئی ہے یہ دوسری موت ہے ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۶ء کے درمیان وہ الہلال اور البلاغ کے ایڈیٹر تھے اس وقت وہ کانگریس میں نہیں تھے وہ مردِ مجاہد تھے۔ اسلامی تحریک کے علمبردار تھے، وہی کام کررہے تھے جو آج جماعتِ اسلامی ہند انجام دے رہی ہے لیکن انھوں نے مسلمانوں کو ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سے آواز دی۔ مسلمان اتنے اونچے اٹھ نہیں سکتے تھے ان کو کسی میدانی علاقے سے آواز دینی چاہئے تھی پھر رفتہ رفتہ ان کو ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر لے جاتے۔ اس زمانہ میں جب کہ شباب پر تھے مسلمانوں کے لیڈروں نے ان سے سوال کیا کہ مولانا کچھ مسلمان ہم کو کانگریس کی طرف بلاتے ہیں اور کچھ مسلمان ہم کو مسلم لیگ کی طرف بلاتے ہیں آپ مشورہ دیجئے کہ ہم کدھر جائیں کس کو ووٹ دیں؟ مولانا ابوالکلام آزاد کا تاریخی جواب صفحات میں آج بھی سنہری حرفوں سے موجود ہے۔ اس مرحوم مولانا آزاد نے کہا: "مسلمانو! کیا تم کو دو ہی راستے نظر آتے ہیں ایک کانگریس کا اور دوسرا مسلم لیگ کا۔ تم کو وہ راستہ نہیں سجھائی دیتا جس پر آدم علیہ السلام نے قدم رکھا، حضرت نوح علیہ السلام نے پتھروں کی بارش میں وہ نقش کیا؟ اور کیا وہ راستہ تم کو دکھائی نہیں دیتا جس پر گامزن ہوکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فاران کی چوٹیوں پر چڑھ کر

دعوت حق پیش کی۔ مولانا آزاد نے بہت ہی بلند چوٹی سے آواز دی تھی چنانچہ مسلمانوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ مایوس ہو گئے اور خود دوسرے راستے کی طرف چلے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم، نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

آپ زندہ مخلوق بن جایئے کوئی سیاسی گدھ آپ پر نہیں ٹوٹ پڑے گا اور آپ یہ نہیں سوچیں گے کہ خود کو کس گدھ کے حوالے کریں۔ آپ مردہ بنے رہیں گے تو یہ سوال ہمیشہ رہے گا۔ قرآن نے بالکل صاف راستہ متعین کر دیا ہے۔ قرآن سورہ حج کے آخری رکوع میں کہتا ہے "یا ایہا الذین آمنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا ربکم وافعلوا الخیر لعلکم تفلحون" اے ایمان والو اس تین نکاتی پروگرام پر عمل کرو۔ تم کو دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی فلاح حاصل ہو سکتی ہے۔ اللہ نعوذ باللہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اپنے آپ کو ایک خدا کے حوالے کر دو اور اس کے حنیف ہو جاؤ، اس کے لئے یکسو ہو جاؤ اپنے آپ کو بالکلیہ جھکا دو، باطل سے کٹ جاؤ، خالص دینی نظریات پروان چڑھاؤ، دوسرے اپنے رب کی بندگی کرو، زندگی کے ہر شعبہ میں کرو اور تیسرے نیکی کا کام کرو، نیکی کی تبلیغ کرو، نیکی کو پروان چڑھاؤ، نیکی کو قائم کرنے کی کوشش کرو، نیکی نام ہے اسلام کا، تاکہ تم کو کامیابی ملے۔ قرآن میں آپ کو بے شمار مقامات پر ایسی آیات ملیں گی۔ تاریخ اسلام میں ہی نہیں بلکہ تاریخ انسانی کے مختلف ادوار میں اس راہ پر چلنے والے ہی کامیاب ہوئے اور اس سے ہٹ کر کسی بھی راہ پر چلنے والے ناکام ہوتے رہے ہیں۔ اللہ ہمیں اور آپ کو اور سارے مسلمانانِ عالم کو راہِ حق پر چلنے کی توفیق دے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں

——— علامہ اقبالؒ

——— ایک صاحب نظر

سید وجاہت حسین

مولانا سید حامد حسین صاحبؒ

ایک نظر میں

- والد بزرگوار کا نام: سید لیاقت حسین خطیب (مرحوم)
- خاندان: خطیب
- مقام پیدائش: اچلپور ضلع امراوتی مہاراشٹر (ایم پی)
- تاریخ پیدائش: فروری ۱۹۲۰ء
- تاریخ عقد: ۱۹ مئی ۱۹۴۵ء
- مدت ملازمت: دسمبر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۱ء تک
- مقامات تعلیم: اچلپور، کھام گاؤں۔ ناگپور
- مدت قیام اچلپور: از پیدائش تا ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء
- مدت قیام کھام گاؤں: ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۰ء
- مدت قیام حیدر آباد: دسمبر ۱۹۴۰ء تا ستمبر ۱۹۵۵ء
- تاریخ آغاز قیام رامپور (یوپی): ۱۲ر فروری ۱۹۵۶ء
- تاریخ آغاز قیام دہلی: ۱۵ر اگست ۱۹۶۰ء
- تاریخ آغاز رکنیت جماعت اسلامی ہند: اپریل ۱۹۴۹ء اور ستمبر ۱۹۵۴ء میں امیر جماعت اسلامی ہند مقرر ہوئے۔
- ۱۱ر اپریل ۱۹۶۶ء کو امیر حلقہ یوپی مقرر ہوئے۔
- ۲۶ر مارچ ۱۹۷۴ء کو پانچویں کل ہند اجتماع کا ناظم مقرر کیا گیا۔

- ۲۶ر جون ۱۹۷۵ء کو ایمرجنسی نافذ ہوئی اور ۱۲ر اگست ۱۹۷۵ء کو ڈی۔آئی۔آر کے تحت ساڑھے ۵ بجے شام گھر سے گرفتار کیا گیا اور ۷ر جنوری ۱۹۷۶ء کو تہاڑ جیل سے ضمانت پر رہا کیا گیا۔

  ایمرجنسی کے خاتمہ کے بعد مقتدر حکومت نے واپس لے لیا اور ان کو پوری طرح آزاد کر دیا گیا۔

- یو کے اسلامک مشن کی سولہویں سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلینڈ کی دعوت پر ۲۴ر مئی ۱۹۷۹ء کو لندن کے لیے روانہ ہوئے اور لندن، برمنگھم، مانچسٹر، لیورپول، لیسسٹر وغیرہ کے دورے کرتے ہوئے ۱۴ر جون ۱۹۷۹ء کو دہلی واپس ہوئے۔
- ۲۲ر ستمبر ۱۹۷۹ء کو مولانا مودودیؒ کا انتقال ہوا۔ ۲۵ر ستمبر ۱۹۷۹ء سے ۲۹ر ستمبر ۱۹۷۹ء تک لاہور میں قیام، جنازے میں شرکت اور مولانا کا دیدار۔
- حکومت ایران کی دعوت پر (انقلاب ایران اور پندرھویں صدی ہجری ۱۴۰۰ھ کے استقبال کی تیاری کے جشن میں شرکت۔ یکم فروری ۱۹۸۰ء سے ۱۴ر فروری ۱۹۸۰ء تک طہران، مشہد اور قم کا سفر۔
- یکم مئی ۱۹۸۲ء کو دوبارہ امیر حلقہ یوپی مقرر ہوئے۔
- ۲۶ر اگست ۱۹۸۵ء کو حج بیت اللہ کے لیے جدہ روانہ ہوئے اور جدہ میں اپنے بڑے صاحبزادے سید لیاقت حسین کے یہاں مقیم رہے۔ حج بیت اللہ سے فراغت کے بعد ۱۳ر ستمبر ۱۹۸۵ء بروز جمعہ ایک کار حادثہ میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ پرانا قبرستان جنت المعلیٰ میں تدفین عمل میں آئی۔ مکہ معظمہ میں امام حرم نے نماز جنازہ پڑھائی۔

إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ○

۱۴۰۶ھ	پناہ یزداں	مولانا سید حامد حسین صاحب	آہ	بسم اللہ الرحمان الرحیم
	۱۳۰	۴۸۴	۶	۷۸۶
۱۴۰۶ھ	انا للہ وانا الیہ راجعون	سحریاں	باادب مولانا سید حامد حسین صاحب	
	۵۸۱	۳۳۱	۴۸۴	

مظفر حسین

دوسرا

بروفاتِ سیّد حامد حسینؒ

چہ خوشا بخت ذات والا شد — بہر دیں چوں امیر حلقہ شد
دین اسلام را سپہ سالار — رایتِ حق باو در بالا شد
حلقہ، حلقہ شدہ منظم کار — گوشہ گوشہ نظام برپا شد
حیثیتِ او شد بہ فیضِ دینِ ہدیٰ — زو کششِ مہر، بزم آرا شد
ذہن اربابِ عقل و دانش و دیں — از خطابش، بصیرت افزا شد
واضح است از کمال تربیتش — ہر دل، آئینہ مجلّےٰ شد
دیں، سیاست، دو قالب اندر جہاں — ہر کس و ناکس ایں ہویدا شد
جذبۂ اتحادِ ملّت و ملک — در صفِ کلمہ گویاں پیدا شد
در جماعت، کسیکہ بود ادنیٰ — ز التفاتِ نگاہش اعلیٰ شد
راست است ایں کہ شد توجہ جاں — جدّ و جہدش بسوئے اعلا شد
شورِ بحثاں ز مقبلاں بہتر — از فیضش کمال پیدا شد
دامنِ دل کشید چہرۂ او — نورِ اخلاص کار فرما شد
دامنِ دل گرفت ارشادش — چوں بہ بزم خطاب گویا شد
بود جائے کہ، شمعِ محفل بود — صدرِ مجلس بصحن صحرا شد
صاحبِ تخت و صاحبِ دیہیم — رو بہ رو کشش کسے نہ اصلا شد
من چہ گویم ز فضل و منقبتش — اُو، روانہ چو سوئے بطحا شد
چکنم شکرِ مہر و احسانش — کرمش بے شمار بر ما شد
از فراقش ہمہ چناں، محزوں — بار دوشش ہمہ چہ بر ما شد
مشک در نیم خاکِ بالیش را — لعل خواہیم آنچہ گویا شد
حج مبرور بود اقبالش — قائدِ دور من فرشتے شد
۱۹۸۵ء سید حامد حسین قائدِ ما — مرقدش جنت المعلیٰ شد ۱۹۸۵ء

سید جعفر علی، انبوہ

سید حامد حسین

جیسا میں نے دیکھا اور سمجھا

ہمیں ۱۹۵۷ء تک ان کے ہمراہ کام کرنے کا موقع ملا۔ ہم نے دیکھا کہ موصوف کو جو دھن اور لگن اپنے مقصد سے تھی ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ انھوں نے جس کام کو اپنے ذمے لیا اور جو فرض ان پر ڈالا گیا اس کو انتھک امنگ اور لگن سے انجام دیا اور اپنا فنکارانہ نقش اس کام پر چھوڑا۔ عزم، حوصلہ، جرأت، فراست اور موقع شناسی کے ساتھ ہر فرض کو انجام دیتے تھے۔ مشکل کاموں کو انجام دینے کے لئے وہ اپنی قوت فکریہ سے کام لے کر اس کو آسان بنا لیتے تھے۔ وہ مختلف عہدوں پر فائز ہوئے۔ ستمبر ۱۹۵۴ء تا فروری ۱۹۵۵ء قائم مقام امیر جماعت اسلامی ہند رہے جبکہ مولانا ابواللیث صاحب آگرہ جیل میں نظر بند تھے۔ اس قلیل مدت میں ملک گیر طوفانی دورہ کیا اور جماعت کے کارکنوں کی افسردگی کو رفع کیا۔ ان کا حوصلہ اور ہمت بڑھائی۔ سرکاری مزاحمت کا مقابلہ کرنے کی امنگ پیدا کی۔ وہ معاون قیم، سکریٹری، ناظم شعبۂ مالیات اور امیر حلقہ یوپی دو مرتبہ مقرر ہوئے۔ ہر ذمہ داری کو اپنی جفاکشی، مستعدی اور جدت طرازی سے انجام دے کر اپنا نقش چھوڑا تاکہ بعد میں آنے والے اس سے فائدہ اٹھائیں۔

وہ نہایت منتظم، ضابطہ کے پابند، وضعدار، صاحب طرز و ادا اور بلند پایہ خطیب تھے۔ سامعین کو اپنے پروقار مدلل انداز بیان سے مسحور کر لیتے تھے۔ ان کا لباس وضع قطع تراش، چال ڈھال، انداز و اطوار ہر چیز میں ان کا اپنا ذوق نفاست نمایاں رہتا تھا جز رسی

کے ساتھ خود کفالت ان کا کردار تھا۔ گھریلو زندگی ہر پہلو سے منظم اور باسلیقہ، ہر چیز قرینے سے، سفر ہو یا حضر اپنی ضروریات قرینے سے رکھنا اور سلیقہ سے استعمال کرنا ان کا معمول تھا۔ رفقاء کی تربیت کے وہ اعلیٰ درجے کے مربی تھے۔ نرمی و گرمی کی لطیف آمیزش ان کا خاص انداز تھا۔ مختصر یہ کہ ارکان جماعت کے لئے وہ ایک پرکشش عمدہ نمونہ تھے۔ خوش پوش، خوش خوراک، انتھک کارکن، ڈاکٹروں کی ہدایات کے خلاف اپنا فرض انجام دینا اور آرام قربان کر دینا ان کے لئے تفریح تھی۔ سفر پر سفر کرنا اس کلمہ کے ساتھ "میرا عزم سفر عزم سفر ہے" ان کی حرارت ایمانی کا مظہر تھا اور ساتھیوں کے لئے حوصلہ افزا۔

۳۶ سال کی مدت طویل نہیں، لیکن یہ سید مرحوم کی زندگی کا نصف ہے۔ اس کو اللہ کی راہ میں مسلسل جد و جہد میں لگا دینا آخرت کے لئے بڑا سرمایہ ہے۔ اس شخص کے لئے جو اہل و عیال رکھتا ہو اور ان کے جملہ فرائض و ضروریات کا کفیل ہو۔

راہ مستقیم پر چلنے والے اپنے نقوش عمل چھوڑ جاتے ہیں جو بعد میں آنے والے قافلوں کے لئے مشعل راہ ہوتے ہیں۔ کسی صاحب قلم کا قول ہے کہ "بڑے لوگوں کی زندگیاں یاد دلاتی ہیں کہ زندگی محض خواب و خیال نہیں ہے، وہ ایک حقیقت ہے" جو لوگ اپنی زندگی میں بااصول عملی نمونہ چھوڑ جاتے ہیں، ان کے نقوش پر چل کر بعد میں آنے والے اپنی زندگیاں کامیاب بنا سکتے ہیں۔ احیاء اسلام کی جد و جہد میں زندگی لگانے والے دونوں جہان دنیا و آخرت کی فلاح حاصل کر سکتے ہیں۔ خدا سید صاحب کی جد و جہد کو قبول فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔

ع "جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے"

مولانا محمد سراج الحسن سکریٹری رابطہ عامہ
جماعت اسلامی ہند

سرگرم رفیق کار جدا ہوگیا

۱۹۵۱ء کی بات ہے میں جماعت اسلامی سے واقف تو تھا مگر اس سے دور دور ہی تھا البتہ سمجھنے کی کوششیں برابر جاری تھیں۔ اس وقت جماعت کے مخالف علماء کی جانب سے جو باتیں جماعت کے خلاف پھیلائی جا رہی تھیں ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جماعت میں غیر مقلدیت کا رجحان پایا جاتا ہے یعنی یہ لوگ اسلاف کو نہیں مانتے لہٰذا اس سے احتراز کرنا لازم ہے۔ یہ پروپیگنڈہ اتنے زور و شور سے کیا جا رہا تھا کہ بہت سے لوگ متاثر ہو رہے تھے میں بھی کسی حد تک اس سے متاثر ہوا۔ انھیں دنوں مولانا سید حامد حسین صاحب رائچور کے دورے پر تشریف لائے اور آپس میں تعارف ہوا۔ آپ اس وقت حلقہ حیدرآباد کے نائب قیم تھے۔

ستمبر ۱۹۵۲ء میں آپ پھر رائچور کے دورے پر تشریف لائے۔ محمد جعفر درائچوری کو جو رکن جماعت تھے۔ اس دورے میں آپ کے ساتھ رہنا تھا مگر کسی مجبوری کی وجہ سے نہ جا سکے اور مجھے آپ کے ساتھ بھیجا۔ اس وقت میں جماعت کا ہمدرد تھا۔ یہ دورہ کم و بیش ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ اس دوران مجھے سید صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے اور تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ اس بار میرا ان سے تفصیلی تعارف ہوا اور تحریکی تعلقات قائم ہوئے بعد ازاں برادرانہ اور دوستانہ بھی ہو گئے اور وقت اور ایام کے ساتھ بڑھتے ہی رہے۔

جماعت کا دوسرا کل ہند اجتماع ۱۹۶۷ء میں حیدرآباد دکن کوٹلہ کے مقام پر منعقد کیا گیا۔ آپ اس وقت نائب ناظم اجتماع تھے۔ اس موقع پر بھی میں آپ سے بہت قریب رہا۔ آپ ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔

یکم اگست ۱۹۵۸ء میں حلقہ کرناٹک معرض وجود میں آیا اور اس کی ذمہ داری ناچیز کے کندھوں پر ڈال دی گئی۔ اس وقت مولانا سے میرے تعلقات کی استواری کا سفر اور آگے بڑھا اور دن بدن اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

۱۹۸۴ء میں میں مرکز منتقل ہوا اور بحیثیت سکریٹری رابطہ عامہ جماعت اسلامی اکثر ریاستوں کا دورہ کیا۔ یوپی کے دورے کا پروگرام مرحوم کے مشورے سے جولائی و اگست ۱۹۸۵ء میں بنایا گیا۔ پورے حلقہ یوپی کا یہ دورہ کم و بیش ڈھائی مہینہ کا تھا مگر بعض وجوہات کی بنا پر اس دورہ کو ملتوی کرنا پڑا۔ اگر یہ دورہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوتا تو مرحوم کے ساتھ میرا سب سے طویل اور آخری دورہ قرار پاتا۔

مرحوم نے اپنی پوری زندگی تحریک اسلامی میں رہتے ہوئے دین حق کے فروغ کی جدوجہد میں صرف کر دی۔ آپ پر جو ذمہ داری بھی ڈالی گئی اسے احسن طریقے سے انجام دیا۔ آپ کی زندگی نظم اور سلیقہ کا نمونہ تھی۔ آپ کا نظم و ضبط، رہن سہن، کھانے پینے سے لے کر تحریکی سرگرمیوں میں ہر جگہ نمایاں تھا۔

آپ کی شخصیت بڑی متاثر کن، آپ کی گفتگو بڑی اثر انگیز اور آپ کا خطاب دل موہ لینے والا ہوتا تھا۔ آپ کا ایک اچھوتا اور نرالا انداز تھا جس سے سامعین ہمہ تن گوش ہو جایا کرتے تھے۔ خاص طور پر جب کسی نئی جگہ پر پہلے پہل خطاب فرماتے تھے تو اس میں اور زور ہوتا تھا۔

کسی رفیق میں کیا صلاحیتیں ہیں؟ ان کو سمجھنے اور آگے بڑھانے کا آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ مشاورتی مواقع پر آپ اپنے نقطۂ نظر کو بڑے ہی مدلل اور واضح انداز میں رکھتے تھے۔ اس سے حقیقت تک پہنچنے اور فیصلہ کرنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔ آپ سلامت فکری اور اصابت رائے کے حامل تھے البتہ مرحوم کے مزاج میں تھوڑی سی تیزی تھی جو کبھی کبھی رفقاء کے لیے تکلیف کا سبب بن جاتی تھی۔

مرحوم کے سانحۂ انتقال سے تحریک ایک سرگرم کارکن سے محروم ہو گئی۔ سید صاحب اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن اقامت دین کے میدان میں اپنی جہد مسلسل سے جو نقوش انھوں نے چھوڑے ہیں وہ ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہم سب کو بھی آخری دم تک اپنے دین کی سربلندی کے لیے سرگرم رہنے کی توفیق دے۔

سیّد صاحبؒ[1]

مولانا ابوبکر اصلاحی

> "سیّد صاحب ایک بے مثل خطیب تھے۔ جب بولتے تھے تو پورا مجمع ہمہ تن گوش ہو جاتا تھا۔ ان کی آواز سحر انگیز، دلپذیر و پُر اثر تھی، وہ اثر و خیالات یقین اور اعتماد سے معمور ہوتا تھا۔"
>
> — اداریہ

۱۹۴۷ء میں ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا جس کے نتیجے میں جماعت اسلامی بھی دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ پریشان کن مسئلہ یہ تھا کہ اکابر پاکستان کے حصے میں پڑ گئے، لہٰذا ہندوستان میں رہ جانے والے کارکنوں کا کیا بنے اور یہاں پر تشکیل جماعت و تنظیم کار اور توسیع دعوت کی ذمہ داری کس طرح انجام پائے۔ چنانچہ ہندوستان میں رہ جانے والے ارباب حل و عقد کی ایک نشست میں جماعت اسلامی ہند کی تشکیل عمل میں آئی اور امیر جماعت کا انتخاب بھی کر لیا گیا اور تنظیم جماعت اور توسیع دعوت کا کام شروع ہو گیا۔ بلاشبہ شروع شروع میں کارکنوں نے خلا محسوس کیا، لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا۔ اور اپریل ۱۹۵۱ء میں بمقام شہر رامپور آل انڈیا اجتماع کے انعقاد کا فیصلہ ہوا۔ تقسیم ملک کے بعد پہلا کل ہند اجتماع تھا۔ جن لوگوں نے تقسیم سے پہلے کے آل انڈیا اجتماعات کو

۱؎ زندگی میں مولانا سید حامد حسین صاحب مرحوم کو میں "سید صاحب" کہہ کر مخاطب کرتا تھا اس لئے ان پر مضمون کے لئے میں نے اسی عنوان کو پسند کیا۔

دیکھا تھا ان کے اندر خوشی کے ساتھ ساتھ اداسی بھی تھی۔ خوشی اس بات پر کہ آل انڈیا اجتماع ہونے جا رہا تھا اور اداسی اس بات پر کہ اپنے سابق اکابر سے ہم محروم ہیں۔ اس لئے اجتماع کے نظم و انصرام، اس کی کارروائیوں اور خطاب عام کا نہیں معلوم کیا حال ہو۔ لیکن اجتماع رامپور نے کارکنوں اور متوسلین جماعت کے اندر مسرت و اطمینان کی لہر دوڑا دی اور انہیں اعتماد حاصل ہوا کہ خدا کے فضل سے ہمارے اندر بھی صلاحیت کے افراد موجود ہیں۔ کیونکہ اجتماع رامپور اپنے نظم و انصرام، کارروائیوں کے استحکام و انضباط اور خطابات اپنی جامعیت و تاثیر کے لحاظ سے معیاری تھے۔ وہ وقت ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ خطاب عام سے واپس آ کر ہم قیام گاہ میں لیٹے تو رفقاء خطاب عام کی تقریروں پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ خطاب عام میں دو تقریریں ہوئی تھیں۔ پہلی تقریر مولانا حبیب اللہ صاحب رانچوی مرحوم کی تھی اور دوسری تقریر مولانا سید حامد حسین صاحب مرحوم کی تھی (آج دونوں حضرات کو مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے) دونوں تقریریں ہر لحاظ سے خوب تھیں اور نہایت ہی کامیاب، عوام و خواص اور کارکنان جماعت کافی متاثر اور ہر طرح سے مطمئن۔ قیام گاہ میں رفقاء خطاب عام کی تقریروں پر گفتگو کر رہے تھے تو کسی خامی، نقص یا کسی طرح کی بے اطمینانی کا کوئی اظہار نہ تھا۔ تقریروں کے خوب سے خوب تر ہونے میں تو سبھی کا اتفاق تھا۔ البتہ گفتگو اس پر ہو رہی تھی کہ دونوں تقریروں میں فضیلت کسے حاصل تھی۔ ایک شخص پہلی تقریر کو افضل قرار دے رہا تھا اور دوسرا دوسری تقریر کو۔ اور کچھ ایسے تھے جن کے نزدیک دونوں ہی تقریریں اپنے عنوان و بیان کے لحاظ سے افضلیت کا مقام رکھتی تھیں۔

بہر حال اجتماع رامپور نے یہ ثابت کر دیا کہ جہاں نو تشکیل جماعت اسلامی ہند نے حالات میں اپنی تنظیم و استحکام کے لحاظ سے اعلیٰ معیار پر ہے وہیں یہ ثبوت بھی فراہم کر دیا کہ خدا کے فضل سے جماعت کو اعلیٰ درجے کے خطباء بھی فراہم ہیں۔ یہی موقع تھا جب پہلے پہل سید حامد حسین صاحب مرحوم سے تعارف ہوا اور پھر تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

مولانا حبیب اللہ صاحب مرحوم رانچی کی خرابی صحت کی وجہ سے جماعت ان کی صلاحیتوں سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکی اور مرحوم بہت جلد ہم سے جدا ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے مگر مولانا سید حامد حسین صاحب نے تو پورے پینتیس ۳۵ سال ہر طرح کے سرد و گرم حالات میں اپنی خطابت سے بھرپور جماعت کی خدمت کی اور اس راہ میں اپنی ساری توانائیاں نچوڑ دیں۔ پورے ملک اور اس کے گوشے گوشے

میں اپنی خطابت کے موتی اور پھول برسائے اور پورا ملک مرحوم کو ایک اعلیٰ درجہ کے مقرر اور بلند پایہ خطیب کی حیثیت سے جانتا ہے۔ پورے ملک میں مولانا نے کتنی تقریریں اور خطابات کئے اس کا شمار تو دور کی بات ہے خود سابق حلقہ مشرقی یو۔ پی جس کا دفتر سرائے میر میں تھا اور میں بھی اس سے منسلک تھا اس حلقے میں ہونے والے ضلعی، شش ضلعی، اور حلقہ واری اجتماعات اور متعدد دوروں میں برابر سید صاحب کے ساتھ رہا۔ ان سب میں کئے جانے والے سید صاحب کے خطابات کو اگر میں شمار کرنا چاہوں تو میرے بس سے باہر ہے۔

مولانا سید حامد حسین صاحب کی تقریر کی چند خوبیاں جو میں نے محسوس کیں انھیں تحریر کر رہا ہوں:

- قد و قامت اور وجاہت ایسی تھی کہ اسٹیج پر کھڑے ہوتے ہی ناظرین کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔
- انداز بیان نہایت ہی پروقار لیکن حد درجہ مؤثر کہ سامعین کی ٹکٹکی بندھ جاتی تھی اور جسے بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی اور مجمع کے کنارے کچھ دیر سننے کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا وہ تقریر میں ایسا کھو جاتا تھا کہ تقریر بغیر ختم ہوئے وہ اپنی جگہ سے ہلتا نہیں تھا اور اسے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ہم کتنے گھنٹے کھڑے رہے۔
- تقریر اپنے عنوان پر ایسی جامع اور مربوط کہ کہیں سے کوئی خلا نہیں محسوس ہوتا تھا۔
- قدرت نے ایسی طاقت و توانائی اور قوت گویائی عطا فرمائی تھی کہ دو دو اور ڈھائی ڈھائی گھنٹے مسلسل زور و شور کے ساتھ تقریر کرتے جاتے تھے مگر تھکتے نہیں تھے۔ والبتہ ادھر کچھ دنوں سے بلڈ پریشر کے مریض ہو گئے تھے اس لئے گھنٹہ، سوا گھنٹے سے زیادہ تقریر نہیں کر پاتے تھے۔
- بڑے بڑے خطبا اور اعلیٰ درجے کے مقررین کا یہ حال ہوتا ہے کہ ان کی ہر تقریر یکساں کامیاب نہیں ہوتی بلکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اگر موڈ ٹھیک ہے تو تقریر بہتر اور کامیاب ہوتی ہے اور سامعین بھی تشفی و تسکین محسوس کرتے ہیں۔ اور اگر موڈ اچھا نہیں رہا تو صرف یہ کہ تقریر کامیاب نہیں ہوتی بلکہ سامعین بھی پوری تشنگی محسوس کرتے ہیں۔

سید صاحب کی یہ بڑی خوبی تھی کہ ان کی ہر تقریر یکساں کامیاب ہوتی اور ہمیشہ سامعین تشفی اور تسکین خاطر محسوس کرتے۔

- مرحوم کی خطابت اور زور بیانی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کی ہر تقریر سامع کے ذہن و دماغ پر اس طرح چھا جاتی کہ محسوس ہوتا کہ یہی تقریر ان کی شاہکار ہے۔
- یہ تقریر کی خوبی اور ان کی خطابت کا کمال ہی تھا کہ جماعت اسلامی ہند کا کوئی بھی اہم اجلاس ہو یا آل انڈیا پیمانے کا اجتماع عام، مولانا سید حامد حسین مرحوم کی تقریر اس کے خطاب عام کا لازمی جز ہوتی تھی۔
- جماعت اسلامی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا فضل رہا کہ اس نے تحریک کو ہر حیثیت و معیار کے افراد کی ٹیم فراہم کی، یہاں تک کہ اعلیٰ درجے کے خطباء اور بلند پایہ مقررین کی کھیپ تیار کر دی جو اپنی تقریر و خطابت اور اپنی قوت گویائی سے تحریک و دعوت کی خدمات انجام دے رہے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ کہ:

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کے بمصداق تقریر و خطابت میں بلند مرتبہ اور اعلیٰ مقام رکھتا ہے لیکن مولانا سید حامد حسین صاحب مرحوم میدان خطابت میں اپنا ایک انفرادی مقام رکھتے تھے۔

مولانا مودودیؒ کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے کہ:

کہاں سے لاؤ گے اب ایسا راہبر لوگو!

تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ میں اسی مصرعہ کو مولانا سید حامد حسین صاحب مرحوم کے بارے میں پیش کر رہا ہوں کہ:

کہاں سے لاؤ گے اب ایسا خوش بیاں لوگو!

آخر میں منصف مبارکپوری کے تین تازہ ترین اشعار پر مضمون ختم کر رہا ہوں:

جو دین پسندوں میں ایک نخوہ راہبر بھی ہو
جو عہد نو کی ثقافت سے باخبر بھی ہو

(بقیہ صفحہ ۱۲۱ پر)

محمد ابراہیم انصاری

اسلام کا ایک عظیم نقیب چلا گیا

اسلام کے ایک زبردست مبلغ مولانا سید حامد حسین صاحب حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر لوٹ رہے تھے کہ کار حادثہ میں شہید ہو گئے اور مکہ معظمہ ابدی آرامگاہ قرار پائی آپ کی عمر [illegible] سال تھی

اوائل زندگی میں سید صاحب حیدرآباد کی ملٹری میں برسرِ روزگار تھے کہ مجاہدِ دوراں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے لٹریچر سے متاثر ہوئے اور عیش و آرام کی زندگی تج کر جماعتِ اسلامی کے رکن بن گئے۔ اس زمانے میں ڈھائی سو روپے کی تنخواہ چھوڑ کر پچاس روپے کے قلیل مشاہرہ پر جماعت کی خدمات قبول کر لی۔ اس کے بعد چالیس پینتالیس سال تک انتہائی سادہ اور عسرت کی زندگی گذاری ماشاء اللہ کثیر العیال تھے مگر اللہ کے فضل و کرم سے بیوی بھی ایسی صبر و شکر کی پیکر اور سلیقہ مند پائی کہ گھریلو اخراجات کے موقع پر مولانا مرحوم کو کبھی فکر مند نہیں ہونے دیا اور مکمل یکسوئی سے دین کی خدمت اور اسلام کی سربلندی کے لئے جد و جہد کرنے کا موقع دیا آپ خود بھی رکن جماعت ہیں

تقریر کے جادوگر

مولانا ہندوستان کے بے مثال خطیب تھے، ان کا اندازِ تقریر انتہائی پُر کشش اور دلنشین تھا کہ سننے والے کے قلب پر دستک دیتا تھا۔ غالباً [illegible] کا دور تھا جب مسلم یونیورسٹی کے طلباء کی کثیر تعداد پر دین بیزاری کی لعنت چھا رہی تھی دہریت کی گندگی فضا کو متعفن کر رہی تھی۔ یونیورسٹی کے اسٹیج پر کسی شرع مسلمان کا خطاب دشوار تھا۔ دینداری کا پاس رکھنے والا، مذاق اور فقرہ بازیوں کا نشانہ بنتا تھا۔ اس زمانے میں مولانا طلباء سے خطاب فرمانے پہونچ گئے۔ اور بدنصیب طلباء آوازے کسنے کے لئے تیار ہو گئے مگر مولانا کی تقریر کو ایک منٹ ہی گذرا تھا کہ کفر کے بادل چھٹنے لگے۔ قلب صمیم پر دستک ہوئی اور اللہ کے باغیوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک گئے۔ رحمتِ خداوندی کی بارش سے ان کا شعور سیراب ہونے لگا۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

ایک بار ضلع بستی یوپی میں فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا۔ مولانا علیہ الرحمۃ ریلیف کے کام میں لگ گئے۔ ایک جلسۂ عام سے خطاب فرما رہے تھے کہ ایک ہندو نوجوان آر۔ ایس۔ ایس کے رنگ میں ڈوبا ہوا نکلا۔ اور مولانا کی تقریر روک دی۔ کچھ سوالات پوچھے، مولانا کے جوابات سن کر اس نے اعلان کیا کہ میں مسلمان ہوتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد اللہ کے رسول ہیں۔

ایک پوری ہندو فیملی نے مولانا کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کیا تھا مگر گوشت خوری کے معاملے میں ہچکچاہٹ تھی۔ مولانا نے فرمایا بیٹے جو چیز اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حلال فرمائی ہے ہم اسے کیونکر حرام کر سکتے ہیں۔ اس خاندان نے لبیک کہا اور مولانا کے ساتھ ایک دسترخوان پر اللہ کی نعمتوں کو خورد و نوش کیا۔

مجاہدِ دوراں

چار سال پہلے بھیونڈی تشریف لائے ان کے ہمراہ جسٹس محمد رفیع الدین احمد انصاری صاحب اور پروفیسر سنگاست سین بھی موجود تھے۔ دو روز غریب خانے پر قیام فرمایا آرام دہ بستر پر سونے سے انکار کر دیا اور صرف چٹائی پر استراحت فرمائی۔ پوچھنے پر بتایا کہ برسوں پہلے کہیں مہمان تھے اور آرام دہ بستر پر دوپہر میں لیٹ گئے نیند آگئی اور پروگرام میں نصف گھنٹہ دیر سے پہونچے اسی روز سے آرام دہ بستر ترک کر دیا۔ صبح ناشتہ میں اور چیزوں کے علاوہ دودھ کا گلاس پیش کیا گیا مگر پینے سے انکار کر دیا۔ پتہ چلا کہ گھر کے بجٹ میں اس کی گنجائش نہیں ہے اسی لئے باہر بھی منظور نہیں ہے پروفیسر سنگاست سین نے بھی کچھ عرصے بعد اسلام قبول کر لیا۔

اسیرِ زنداں

۱۹۷۵ء میں جب ہندوستان میں ایمرجنسی نافذ کی گئی۔ مولانا مہاراشٹر کے دورے پر تھے انہیں پتہ چلا کہ تمام اکابرینِ جماعتِ اسلامی گرفتار کر لئے گئے ہیں اور ان کے نام بھی وارنٹ نکل چکا ہے مولانا فوراً دہلی پہنچ گئے اور کوتوالی حاضر ہو گئے۔ ڈیڑھ سال اسیرِ زنداں رہے اور وہاں بھی بندگانِ خدا کے دلوں پر اسلام کی عظمت کا سکہ ثبت

کرتے رہے۔

مولانا کی عمر ۶۵ سال تھی۔ قلب کا مرض بہت بڑھ گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے سختی سے آرام کی تاکید کی تھی لیکن دین کی سربلندی کی راہ میں سرفروشی کی تمنا جوان تھی۔ راہ حق کی فوج کے سپاہی ریٹائرمنٹ کے لفظ سے واقف نہیں ہوتے۔ نصف زندگی ریل گاڑی کی بنچوں پر کٹ گئی۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں دورہ فرمایا اور اللہ کے بندوں کو اس کے احسانات اور اپنے فرائض یاد دلاتے رہے۔

اکتوبر ۸۴ء میں چھٹیاں لیکر حیدرآباد و بمبئی عزیزوں و رشتہ داروں سے ملنے تشریف لائے تھے۔ بیگم صاحبہ بھی ساتھ تھیں۔ غریب خانہ پر چند روز قیام فرمایا۔ طبیعت ناساز تھی۔ مکمل آرام کی ضرورت تھی مگر لوگوں کو پتہ چلا تو بمبئی اور بھیونڈی میں پروگرام طے ہوگئے اور مولانا خندہ پیشانی سے پھر سرپیکار تھے۔

جہادِ زندگانی

انصاری باغ کے عظیم سانحہ پر اس مجاہد کی ڈھارسیں اور دلاسے اسلام کی عظیم تعلیمات کا نمونہ تھیں اور میرا غم اور بوجھ بہت ہلکا محسوس ہوا۔ لیکن آج ان کی جدائی کا غم ہے — ملتِ اسلامیہ کا عظیم نقصان ہے آپ بھی دعا فرمائیں کہ پروردگار ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے اور اپنے دین کی سربلندی کے جہاد کے لئے ہمیں ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ اکبر — اللہ اکبر — انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جہادِ زندگانی میں ہم سب منکرات سے نبرد آزما ہیں۔ دورانِ جہاد اگر کوئی ساتھی یا سید حامد حسین صاحب جیسا کمانڈر شہید ہوجائے تو ہم بیٹھ کر ماتم نہیں کرسکتے۔ ہمیں اور زیادہ مستعدی سے ہتھیار تھام لینا چاہئے۔ اللہ حامی و ناصر ہے۔

خوشخبری

"حیاتِ نو" کا اگلا شمارہ انشاء اللہ فروری ۱۹۸۵ء کا شمارہ ہوگا جس میں آپ ڈاکٹر قاضی اشفاق احمد کا انٹرویو ملاحظہ فرمائیں گے جو ۱۵ر اکتوبر کو جامعہ نگر کے موقع پر لیا گیا۔ آسٹریلیا میں اسلام اور مسلمانوں کی پیش رفت، ہندوستان میں تحریک اسلامی کا مستقبل — تحریکات اسلامی کے کرنے کے کام اور بہت سے دلچسپ اور معلوماتی سوالات و جوابات — آپ تحریک اسلامی کے سرگرم کارکن اور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے ساتھی ہیں

——— ادارہ

قاضی م زین العابدین۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

آہ! خطیبِ برار

سید حامد حسین امیر حلقہ اترپردیش کے انتقال سے جماعتِ اسلامی ایک اچھے خطیب سے محروم ہوگئی ہے اور حلقہ برار بھی ایک شعلہ بیان خطیب سے محروم ہوگیا اس لئے حلقہ برار کے مسلمان جتنا افسوس کریں کم ہے سید صاحب صرف خطیب خاندان سے تعلق ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنے اندر خطابت کی شان بھی رکھتے تھے۔

سید صاحب کا تعلق اس مجاہد خاندان سے ہے جن کے ایک بزرگ یعنی سید صاحب کے جدِ اعلیٰ سید عبدالملک شنی جو غزنی کے انبار محلہ کے رہنے والے تھے ۳۹۲ھ ہجری میں غزنی سے شاہ عبدالرحمان غازی کے پرچم تلے جذبۂ جہاد سے سرشار ہوکر دریائے سندھ عبور کرنے کے بعد دریائے نربدا اور دریائے ترپتی کو عبور کرکے علاقہ دکن میں داخل ہوئے۔ محمد بن قاسم کی فتوحات صرف سندھ تک محدود رہیں لیکن شاہ عبدالرحمان غازیؒ کا ہراول دستہ پہلی مرتبہ دکن میں داخل ہوا۔

راجہ ایل جس نے ایلچپور شہر فتح کیا تھا اسی ایل خاندان کا ایک ہندو راجہ علاقہ برار پر حکمرانی کر رہا تھا اور اس کا دارالخلافہ ایلچپور تھا چوتھی صدی ہجری ختم ہونے والی تھی شاہ عبدالرحمٰن غازیؒ کی چھوٹی سی فوج کا مقابلہ اسی ایلچپور شہر کی چھوٹی سی دو ندیوں ساپن اور بچھن کے کنارے ہوا۔ راجہ کی فوج نے حملہ آور مسلمانوں کو شکستِ فاش دی۔

شاہ عبدالرحمٰن غازی شہید ہوگئے اور ایلچپور شہر کے باہر انہی ندیوں کے کنارے آپ کا مقبرہ ہے سید صاحب کے جدِ اعلیٰ سید عبدالملک شنی، شاہ عبدالرحمان غازی کی شہادت کے بعد غزنی واپس نہیں گئے بلکہ ایلچپور ہی میں سکونت اختیار کی اور مرقدِ غازیؒ سے جدا ہونا گوارہ نہیں کیا اس طرح آپ کا خاندان ایلچپور میں ۳۹۲ھ ہجری سے مقیم ہے اور آج

ایک ہزار چودہ سال گذر چکے ہیں اور بفضلہٖ تعالیٰ آپ کے خاندان کے افراد آج بھی یہاں عزت وآبرو کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپکے خاندان میں کئی نامور بزرگ گزرے ہیں جن کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ خاندانِ مغلیہ کے زوال کے بعد جب حیدرآباد دکن نے ایک آزاد ریاست کی شکل اختیار کرلی اس وقت آصف جاہ کے دور میں سید صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ سید عبدالخلیل مشنی کو دربار آصف جاہ سے خلعت دی گئی اور ایلچپور شہر میں سلطان محمد تغلق کے داماد کی تعمیر کردہ مسجد کی امامت وخطابت آپ کے ذمہ تفویض کی گئی نیز اس سلسلے میں جاگیر بھی عنایت کی گئی جس میں سے کچھ اراضی آج بھی آپ کے خاندان میں موجود ہے اس وقت سے آپ کا خاندان ایلچپور کے خطیب کی حیثیت سے مشہور ہوا۔

سید صاحب کے پردادا خطیب سید اشرف حسین صاحب حافظ قرآن اور عالم دین تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے سید صاحب کے دادا خطیب سید محمود حسین صاحب تھے جو عالم دین اور مورخ تھے۔ 'تاریخ مجددی' آپ کی مشہور تصنیف ہے خطیب سید محمد حسین صاحب کے فرزند خطیب سید عظمت حسین صاحب کو انگریزوں سے خطاب ملا تھا۔

سید صاحب کے والد کا نام خطیب سید لیاقت حسین تھا جو ایلچپور شہر کی میونسپل کمیٹی کے چیرمین رہے ہیں جن کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ والد صاحب کے انتقال کے وقت سید صاحب کی عمر صرف چار سال تھی۔ سید صاحب ۱۹۲۰ء میں شہر ایلچپور جسے آزادیٔ ہند کے بعد اچلپور کا نام دیا گیا، ہی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سے لیکر میٹرک تک تعلیم آپ نے ایلچپور شہر ہی کے ہائی اسکول میں پائی۔ اس کے بعد انٹر کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آپ جالنہ تشریف لے گئے جہاں آپ کے بڑے بھائی خطیب سید صفدر حسین صاحب 'پی ایس آئی' پولس سب انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔

علاقہ برار مردم خیز علاقہ ہے۔ صرف بیسویں صدی میں بیسیوں نامور شخصیتوں نے یہاں جنم لیا جن میں سے بیشتر اللہ کو پیارے ہوگئے اب ایک آخری شمع اس انجمن کی زندہ باقی ہے اور وہ بزرگ شخصیت ہے حضرت قبلہ الحاج میر غلام احمد حسن صاحب متوطن تیلگاؤں وسابق ایم ایل اے کی جو علاقہ برار میں ۸۸ سال کی عمر میں مجاہدانہ مجاہد کی طرح دین کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں

شبیر احمد فلاحی

فقیری میں بھی تھی شانِ امیری

سید صاحب کو میں اپنے بچپن ہی سے دیکھتا رہا ہوں۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سفر میں گذرتا تھا۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے جب بھی منزل پر پہنچتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ابھی ٹہلتے ہوئے آرہے ہیں۔ سفر کے گرد وغبار کبھی ان کی تازگی اور ان کے بارونق وجود کو متاثر نہ کرسکے۔ ان کے رکھ رکھاؤ، وضع قطع اور سج دھج سے یہی معلوم ہوتا کہ آپ بہت امیر شخص ہیں اور ان کے روزمرہ کے مصارف بہت زیادہ ہوں گے۔ ایک بار آپس میں ہم لوگ ان کی شخصیت پر بات کررہے تھے اور ہمیں تحریک کا کوئی شعور نہ تھا۔ ہمارا ایک ہم عمر ساتھی جو ابھی بچہ تھا بول کر 'میاں مہینہ میں کئی سو روپے کے تو صرف سگریٹ پیتے ہیں' ان کی تنخواہ بہت زیادہ ہوگی۔ ہم ساری باتیں ان کے مقام ومرتبہ کے پیش نظر ہو رہی تھیں۔ کیونکہ اس وقت ہم کو ان کی تقریر کے مواد سے خاص تعلق نہیں تھا۔ ہم ان کی آواز کی گھن گرج سے ہی محظوظ ہو رہے تھے اور 'نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو' جیسے الفاظ ہی ہماری گرفت میں آسکتے تھے۔ ہمارے ذہن پر صرف یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ وہ کوئی بہت بڑے آدمی ہیں اور اس عظمت کا تصور ان کی تقریر اور ظاہری رکھ رکھاؤ دونوں ہی سے ہمارے ذہنوں میں آیا تھا۔

لیکن جب ان سے قریب رہنے کا موقع ملا ان کے حالات سے واقفیت ہوئی، ان سے بے تکلفی کے ماحول میں کھل کر گفتگو ہونے لگی تو میرے گذشتہ تصورات کو زبردست صدمہ پہنچا۔ معلوم ہوا کہ آپ کی زندگی بہت سادہ ہے۔ بہت معمولی بجٹ میں زندگی گذاری جارہی ہے۔ جماعت سے جو مشاہرہ ملتا ہے اتنے بڑے خاندان کے لیے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے پھر اس معمولی رقم سے باعزت اور پروقار انداز میں گھر کو چلانا اور خود کو بھی سجائے رکھنا انھیں کے بس میں تھا۔ ہم سادہ انداز میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ بہت غریب اور مفلس تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا پورا اہتمام کہ اس کا اظہار دوسروں پر نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ جو کچھ دے رہا ہے اسی سے زندگی اس طرح گذاری جاسکتی ہے کہ امیر کو بھی رشک آئے۔ انھیں یہ راز معلوم ہوگیا تھا کہ اس

دنیا میں نہ کوئی امیر ہے نہ کوئی غریب۔ اگر کسی کے پاس خودداری کی دولت ہے تو وہ بے نیاز کا مالک ہے، زندگی گذارنے کا ڈھنگ اور رہنے کا سلیقہ آتا ہے تو تھوڑی رقم سے بھی امیری کی شان اپنی زندگی میں پیدا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص صاحبِ ثروت ہے، اس کے گھر دولت کا انبار ہے مگر اس کا دل غریب ہے۔ اس کا ذہن مفلسی کا شکار ہے۔ اس کے بازار میں خودداری کی کوئی قیمت نہیں ہے تو ایسا شخص حقیقت میں بڑا فقیر اور قلاش ہے۔

سید مرحوم کہا کرتے تھے کہ میں تو   گذارتا ہوں۔ ایک دن مجھ سے فرمایا کہ آج میری اہلیہ نے گھر سے چلتے وقت مجھے بیس پیسے سگریٹ کے لیے دیے ہیں۔ اس کے علاوہ میری جیب میں کچھ نہیں ہے۔ یہ بات میرے ایک جملے کے جواب میں انھوں نے کہی تھی۔

آپ اپنی گھریلو زندگی میں بھی قواعد و ضوابط کے نفاذ میں بہت سخت تھے۔ (کم عمر صاحبزادگان ان کی زندگی کے اس پہلو سے بسا اوقات پریشان سے نظر آنے لگتے تھے لیکن جوں جوں وہ بڑے ہوتے گئے اپنے باپ کے ڈسپلن میں مٹھاس پاتے گئے۔ مرحوم کو اس حقیقت کا پورا ادراک تھا کہ اگر بچپن میں بے اصولی اور لاپرواہی کا کوئی شکار ہو گیا تو آگے چل کر اس میں سدھار لانا مشکل ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے اندر کوئی برائی ہے اور کسی مرحلے میں وہ برائی ختم ہو جائے گی اور اس کی جگہ اچھائی لے لے۔ لیکن وہ طور طریقے جن کو گناہ یا ثواب کی میزان میں نہیں رکھا جا سکتا وہ صرف کم عمری میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس مرحلہ میں جو کچھ مل گیا وہ زندگی بھر ساتھ رہے گا۔ جو چھوٹ گیا وہ کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ چنانچہ سید مرحوم نے اپنی اس خوبی کو اپنے بچوں میں بھی اتارنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب رہے۔ اپنے بچوں میں خود اعتمادی اور خودداری پیدا کی۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ انھیں احساسِ زیاں کی دھوپ اپنی گرفت میں نہ لے سکی۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ ہمارے ابو میاں نے خود کو فنا فی الجماعت نہ کیا ہوتا اور یہ اور یہ کیا ہوتا تو آج ہم یہ ہوتے۔ آپ ان کی اس انداز سے تعلیم و تربیت کرتے رہے کہ اپنے مقدر کو وہ خود اپنے ہی خونِ جگر میں ڈبو کر تلاش کر لیں۔ کل خدانخواستہ کوئی ناکامی ہو جائے تو اس کی ذمہ داری ان پر یا ان کی کوشش پر نہ ڈالیں۔ ان کی اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاندان کے سارے افراد ان کے ذہنی سانچے میں ڈھل گئے۔ اور اس پہلو سے کبھی وہ ذہنی کرب میں مبتلا نہ رہے۔

سوال یہ ہے کہ انتہائی محدود وسائل کی موجودگی میں اپنی عائلی زندگی کی گاڑی کو کس طرح اس معیار کے مطابق چلاتے رہے جو بالعموم دوسروں کے لیے ناممکن سا لگتا ہے۔ ان کا یہ کردار بہت دلچسپ اور قابلِ تقلید ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے نہ ہی وہ مطلوب ہوتی ہیں۔ لیکن اس پہلو سے وہ بہت اہم ہوتی ہیں کہ اگر ان کو انسان اپنی زندگی میں جگہ دے دیتا ہے تو اس سے مفید نتائج سامنے آتے ہیں اور بہت سی الجھنوں سے آدمی کو نجات مل جاتی ہے۔

کسی شخص کے معیارِ زندگی یا اس کے ذوق کو دیگر ضروریاتِ زندگی کے بعد اس کے ظاہری رکھ رکھاؤ اور لباس سے ناپا جا سکتا ہے۔

آپ کے لباس کا شعبہ بھی انتہائی منصوبہ بند اور ڈسپلنڈ تھا۔ لہٰذا جو کپڑا بھی پہنتے اس میں تازگی اور نئے پن کی جھلک ہوتی تھی۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ اپنے اور بچوں کے سارے کپڑوں کی کٹنگ خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ اس کام کے لیے باقاعدہ وقت نکالتے تھے۔ کبھی انھوں نے اپنا کپڑا درزی سے نہیں سلوایا۔ آپ کے کپڑوں کی عمریں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ شیروانیاں، قمیصیں، ٹوپیاں، جوتے وغیرہ سب کے استعمال کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ یعنی یہ کہ اس ماہ کی فلاں تاریخ سے کن قمیصوں اور شیروانیوں کو استعمال کیا جائے گا۔ پائجامہ تو ہر موسم میں ایک مخصوص کپڑے کا پہنتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض شیروانیوں کی عمریں تیس سال سے بھی زیادہ ہیں۔ ہم لوگ کبھی کبھی سوال کیا کرتے تھے کہ یہ کب آپ نے خریدا ہے۔ ان کا جواب سن کر بے اختیار ہنسی آجاتی تھی۔ اس پر وہ خود بے اختیار ہنس پڑتے اور کہتے کہ ارے تم ہنس رہے ہو، تجربہ کر کے دیکھو یہ محال نہیں ہے۔ غالباً چھ سال قبل کی بات ہے۔ جاڑے میں جوتوں کا ایک جوڑا پہن کر آئے جس کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کو ۱۹۵۲ء میں انھوں نے خریدا تھا۔ وہ گھڑی جس کو فوج میں ملازمت کے ایام میں باندھنا شروع کیا تھا کچھ ہی عرصہ قبل اتاری ہے۔ وہ ابھی تک صحیح وقت دے رہی ہے۔ مختصر یہ کہ ان کے استعمال کی بیشتر اشیاء کی تاریخ اسی نوعیت کی ہے۔ یہاں ان امور کو بیان کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کو زیادہ سے زیادہ مدت تک استعمال کرنا کوئی کارنامہ ہے جس کو مرحوم نے انجام دیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کتنی عسرت اور تنگدستی کے ادوار سے گذرے ہوں گے مگر اپنی سلیقہ مندی

سے ان پر پردہ ڈالے رہے۔

سہنے سینے کا وہ انداز جس کو آدمی خوشحالی اور دولت کی فراوانی میں ہی اختیار کر پاتا ہے اس کو انھوں نے برعکس حالات میں بھی اختیار کیا۔ اور اپنے ظاہر سے کبھی اس کا اظہار نہیں ہونے دیا کہ اب تو تنگی ہے اوندھے سیدھے کسی طرح زندگی گذار لی جائے۔ سلیقہ سے رہنا اب ممکن نہیں۔ بلکہ زندگی کو آخری سانس تک بڑے ذوق و شوق اور حوصلے کے ساتھ گزارا۔ پژمردگی، مایوسی یا بے دلی کو اپنے پاس نہیں آنے دیا اور یہ بھی مومن کی ایک شان ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ انداز پسندیدہ ہے۔ ایک بار کوئی قافلہ آپؐ سے ملنے آیا۔ ایک شخص الجھے ہوئے بالوں اور سفر کی گرد و غبار لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آپؐ نے اس حالت کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ نہا دھو کر اپنے بالوں میں کنگھا کیوں نہیں کر لیتا۔ اس کے برعکس ایک دوسرے شخص نے پہلے غسل کیا، کپڑے تبدیل کیے، کنگھا وغیرہ کر کے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے پسند فرمایا اور تعریف کی۔

آپ کے اس نظم و ضبط کو گھر میں نافذ کرنے میں آپ کی اہلیہ محترمہ نے جو دلچسپی لی اس کا ذکر یہاں نہ کیا گیا تو حق تلفی ہوگی۔ گھر کے لیے مرحوم کے وضع کردہ اصول و ضوابط کو نافذ کرنے کی ذمہ داری زیادہ تر محترمہ ہی پر تھی۔ اس ضمن میں ان کے تعاون کا مرحوم بہت ذکر کرتے اور سراہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں آپ کو سلیقہ عطا فرمایا تھا وہیں اس کے لیے گھر کی فضا کو بھی سازگار بنایا تھا۔ ورنہ یہ نہ ہو تو کوئی چاہے کتنا ہی نظم پسند ہو کسی منظم خاندان کا سربراہ نہیں رہ سکتا۔ سید صاحب کا یہ کردار صرف اپنی انفرادی زندگی اور گھریلو زندگی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا دائرہ آپ کی تحریکی اور اجتماعی زندگی تک پہنچتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کو غیر فطری قرار دیا جاتا۔ سلیقہ، نظم و ضبط، اصول پسندی آپ کے مزاج میں شامل تھے۔ لہٰذا ان کا ظہور گھر سے لے کر مرکز تحریک تک یکساں طور پر ہوتا تھا۔ ڈسپلن میں اپنی اولاد سے لے کر اپنے ماتحت رفقاء اور سارے لوگوں کو کس کر رکھتے تھے اور یہ تو حقیقت ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی انفرادی اور گھریلو زندگی میں نظم و ضبط اور سلیقے کے ساتھ نہیں رہ سکتا تو اس سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ اس کی وفات سے آگے کی اکائیوں میں یہ ماحول پیدا ہو سکے گا۔

ہاجرہ بانو، کانپور

خواتین میں دعوت کے لیے فکرمند

ہم لوگ سید صاحب کی بیت اللہ سے واپسی کے شدت سے منتظر تھے۔ کیونکہ وہ بیت اللہ روانگی سے پہلے ہم خواتین کے تربیتی اور علاقائی اجتماعات کی ایک لمبی فہرست بنا کر گئے تھے۔ اور سید صاحب کی واپسی کے بعد ان تمام پروگراموں پر عمل درآمد ہونا تھا۔ ہم لوگ اس پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے منصوبے بنا رہے تھے کہ کس طرح ہم گھریلو مصروفیات سے وقت بچا کر ان پروگراموں میں لگائیں۔ لیکن کیا خبر تھی کہ موت کا ہاتھ ان کو لینے کے لیے اتنا اچانک نمودار ہوگا۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ انسان اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر کس قدر مجبور و بے بس ہے۔ مشیتِ الٰہی پر راضی و ثابت قدم رہنا ہی مومن کا مقصدِ زندگی ہے۔ اب سے تقریباً اٹھارہ بیس سال پہلے کی بات ہے جب مجھے پہلی بار پریڈ گراؤنڈ کانپور میں سید صاحب مرحوم و مغفور کے خطاب عام سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ جلسے کی کارروائی شروع ہونے میں ابھی دو چار منٹ باقی تھے۔ میں سراپا انتظار گوش بر آواز تھی کہ مائک پر صدا بلند ہوئی، جناب سید حامد حسین تشریف لا چکے ہیں۔ آپ حضرات اپنی اپنی نشست سنبھال لیں۔ چنانچہ مائک پر سید صاحب کی آواز ابھری، حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا:

رکھیں احباب مجھے تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

پھر جو تقریر فرمائی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فہم و فراست، بصارت و بصیرت کا ایک تیز رو دریا ہے جو انسان کی منزلِ انسانیت تک رہنمائی کرنے کے لیے اس کے تحت الشعور اور لاشعور سے ہزاروں ابھار بر آمد کر کے ان کی قدر و اہمیت سے شناسا کرانے کے لیے ہی وجود میں آیا ہے۔ اتنا مدلل، جامع، منفرد، دل نشین اور پر زور بیان میں نے اس سے پہلے کبھی نہ سنا تھا چنانچہ میں سید صاحب

کی عالمانہ و مدبرانہ عظمت کی دل ہی دل میں معترف ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد جب کبھی کانپور میں سید صاحب خطابِ عام فرماتے میں ضرور شریک ہوتی۔ الا یہ کہ مجھے کوئی خاص مجبوری ہوتی۔ لیکن یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ ہم خواتین کے سید صاحب سے کبھی اتنے قریبی تعلقات ہوجائیں گے کہ (پردے کے ساتھ) آپ سے براہِ راست فیضیاب ہونے کا موقع ملے گا۔ ۱۹۸۱ء میں جب آپ پہلی بار یو۔پی کے امیرِ حلقہ منتخب ہوئے تو آپ نے ارکانِ جماعت کے تربیتی اجتماعات منعقد فرمائے اور بالکل نئے انداز پر ارکانِ جماعت کی اصلاح وتربیت فرمائی۔ آپ کے طریقۂ تربیت سے جہاں ارکان خواتین میں کچھ گھبراہٹ سی تھی وہیں پر خوشی و مسرت بھی۔ کیونکہ اصلاح وتربیت کا جو انداز آپ نے اختیار فرمایا تھا وہ انوکھا اور سخت گیر ہونے کے ساتھ ساتھ مشفقانہ بھی تھا۔ چنانچہ بڑی زوردار نشستیں ہوتیں۔ میں اگرچہ اس وقت جماعت اسلامی سے باقاعدہ منسلک نہیں تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے اماں بی مرحومہ (قیصر بیگم نیازی صاحبہ) کی سفارش پر شریکِ اجتماع ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ غالباً چہار روزہ پروگرام تھا۔ اور میں نے اپنے یہ شب و روز اجتماع گاہ میں گذارے۔

اس طرح جماعت اسلامی کے مزاج اور اس کی کارکردگی کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ جہاں سید صاحب کی پوری زندگی تحریکِ اسلامی اور دینی خدمات کے لیے وقف تھی وہیں آپ کو خواتین میں دینی بیداری پیدا کرنے نیز انھیں متحرک و فعال بنانے سے خصوصی دلچسپی تھی۔ خواتین کو دینی وتحریکی حیثیت سے اوپر اٹھانے میں سید صاحب کی کوششوں کا بڑا دخل رہا۔ ہم ان کے اس احسان کی رہینِ منت ہیں۔ ہم کانپور کی خواتین کا تو یہی تاثر ہے بلکہ یقین ہے کہ اترپردیش میں تحریکِ اسلامی سے وابستہ خواتین کا یہی تاثر ہوگا۔ ہم لوگوں کی کم علمی اور عدم صلاحیت کے باوجود چھوٹی سے چھوٹی کارگذاری پر بےحد خوش ہوتے۔ طرح طرح سے حوصلہ افزائی فرماتے اور ہمت بندھاتے۔ دین کی راہ میں ہماری مشکلات کو بغور سنتے اور انھیں حل کرنے کی فکر کرتے۔ دعوتِ اسلامی کے رموز و نکات ایک شفیق استاذ کی طرح تفصیل سے سمجھاتے۔ اصرار کرتے کہ ہم سوالات کریں اور ان کے جوابات سمجھیں۔ جب ہم لوگوں میں سوال کرنے کی ہمت نہ پاتے تو خود ہی سوال کرتے اور جواب مانگتے۔ ہم لوگ کبھی صحیح جواب دیتے اور کبھی غلطی کر جاتے تو پھر خود ہی اس کی تصحیح فرماتے۔

۱۹۸۲ء میں جب ٹرانسپورٹ نگر کانپور میں خواتین کا ایک اجتماع حلقہ کی سطح پر ہوا اور اوّل تا آخر تمام کارروائی خواتین ہی نے انجام دی تو اس قدر خوش تھے گویا انھیں ان کے خوابوں کی تعبیر مل گئی ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ محترم سید حامد حسین صاحب (مرحوم) اور محترمہ قیصر بیگم نیازی صاحبہ (مرحومہ) کی کوشش ولگن اور محنت وخلوص کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم خواتین میں اللہ کے فضل وکرم سے کچھ دینی جذبہ بیدار ہوا اور دین کی بات کہنے کا کچھ سلیقہ بھی آیا۔ اپنے دو مشفق رہنماؤں سے محرومی کے بعد کم از کم ہم کانپور کی ارکان خواتین کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دینی اصلاح وتربیت کے اعتبار سے ہم یتیم ہوگئی ہیں۔ آہ! اب کون اتنے شوق، خلوص ولگن سے ہمیں دینی امور سمجھائے گا۔ اور اب کون اتنی توجہ و دلچسپی سے ہمارے پروگرام بنائے گا۔ آہ! کیسی کیسی نادر و نایاب ہستیاں دنیا سے اٹھتی جارہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کا بہترین نعم البدل عطا فرماکر اس خلا کو پُر فرمائے (آمین) اور جو چراغ ہمارے مہربان مربیوں نے جلایا تھا اس کی روشنی میں اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین پر گامزن فرمائے اور لمحہ لمحہ آگے بڑھنے کی مزید توفیق عطا فرمائے۔ ہم ان مقدس و پاک روحوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں بلند درجات عطا فرمائے۔ (آمین)

حشر تک مرقد پہ تیری نور برسے بے شمار
اور میزانِ عمل پر ہو ترا اونچا وقار

شہادت

مراسمِ حج اور زیارتِ مدینہ منورہ کی تکمیل کے بعد اللہ تعالےٰ نے مرحوم کو بلانا بہتر سمجھا۔ اور کار کا ایک معمولی حادثہ موت کا سبب بن گیا۔ کتنا خوش قسمت انسان تھا کہ موت آئی بھی تو حادثہ کے ذریعے جو شہادت کی موت ہوتی ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو مسلمان کسی حادثے میں اچانک جاں بحق ہو جاتا ہے اس کو مقامِ شہادت نصیب ہوتا ہے۔ حالتِ سفر کی موت بھی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ مکہ مکرمہ میں نمازِ جنازہ کا پڑھا جانا اور جنت المعلیٰ میں دفن کیا جانا یہ سب وہ اجر وثواب ہیں جو حق کے سپاہی کو دنیا ہی میں عطا کیے جارہے ہیں اور آخرت میں بھی اللہ قابلِ رشک مقام عطا فرمائے۔" (ان شاء اللہ)

مولانا نظام الدین اصلاحی

نسیم غازی

یتیم لڑکی کا باپ

پیارے نبیؐ کے بہترین اسوہ میں یہ بات بھی نمایاں طور سے ہمیں نظر آتی ہے کہ آپؐ اپنے ماموریں، اپنے رفقاء واحباب نیز دیگر ضرورت مندوں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اس کام میں یہ بات نہ مانع ہوتی تھی اور نہ آڑے آتی تھی کہ آپؐ رسالت و نبوت کے عظیم منصب پر فائز ہیں اور اسی کے لحاظ سے آپؐ پر لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے سلسلہ میں بڑی ذمہ داریاں ہیں بلکہ آپؐ کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ بندگانِ خدا کی خدمت، خبرگیری، ان کا تعاون اور ان کی مدد آپؐ کے کام کا خاص حصہ تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ والہانہ طور پر آپؐ سے عقیدت و محبت رکھتے، آپؐ کی باتوں پر جان دینے کو تیار رہتے اور آپؐ کے عشق میں دل و جان سے آپؐ کا ساتھ دیتے۔ پیارے نبیؐ کی سیرت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر آپؐ کے پاس کوئی مسافر، کوئی تنگ دست، کوئی محتاج اور ضرورت مند آتا تو آپؐ سب سے پہلے خود بڑھ کر اس کی مدد کرنے کی کوشش فرماتے اور اپنے گھر میں معلوم کراتے کہ اس شخص کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کچھ ہے یا نہیں۔ اور جب یہ معلوم ہوتا کہ گھر میں تو کئی روز سے چولہا بھی نہیں جلا ہے اور اس شخص کی مدد کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد ہی آپؐ اپنے دوسرے ساتھیوں و پیروؤں سے اس کی مدد کے لیے اپیل کرتے۔ آپؐ کی یہی عادتِ مبارکہ اور انسانوں سے بے حد محبت تھی کہ حضرت زیدؓ نے اپنے ماں باپ اور وطن کو چھوڑنا گوارا کر لیا لیکن پیارے نبیؐ کی ذاتِ مبارکہ سے جدا ہونا برداشت نہ کیا حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ زیدؓ کو پیارے نبیؐ سے کوئی دنیاوی عیش و عشرت، مال و جاہ اور روپیہ پیسہ ان میں سے کچھ بھی نہیں ملا تھا بلکہ وہ تو پیارے نبیؐ کی محبت، اخلاق اور کردار سے متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ آپؐ جو کچھ کھاتے پہنتے ہیں وہی مجھے بھی کھلاتے پہناتے ہیں اور میرے بہترین ہمدرد و غمگسار ہیں۔

جو لوگ نبیؐ کے مشن کو لے کر آگے بڑھنے کا عزم رکھتے ہیں اور اللہ کے دین کو اللہ کے تمام بندوں تک پہنچانا چاہتے ہیں اور اللہ کے دین کو غالب و نافذ دیکھنے کے آرزومند ہیں ان کے لیے نبیؐ کے اس اسوہ پر عمل کرنا لازمی ہے اور اس کے بعد ہی وہ لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن سکتے ہیں اور یہ بات میں صاف طور سے عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ صفت جہاں ہمارے عوام و ماموریں میں پائی جانی ضروری ہے وہیں ہمارے امراء و قائدین کو بھی اس سے متصف ہونا لازمی ہے۔

محترم مولانا سید حامد حسین مرحوم کے اندر اس صفت کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب مجھے مولانا کے محلہ میں رہائش کا موقع ملا۔ نئے محلہ میں میرے لیے تمام ہی لوگ اجنبی تھے اور نئی نئی رہائش اختیار کرنے کی وجہ سے کچھ مسائل کا بھی سامنا تھا اور پھر میری اہلیہ کی علالت میرے لیے اس نئی جگہ پر پریشان کن تھی۔ مولانا مرحوم اسی محلہ میں قیام پذیر ضرور تھے لیکن ان کی طرف سے مجھے تعاون مل سکے گا اس کی مجھے کم ہی امید تھی۔ اس وجہ سے کہ مولانا جماعت اسلامی ہند کے ذمہ داروں میں سے تھے اور اکثر و بیشتر دوروں پر رہا کرتے تھے نیز ملت کے مسائل حل کرنے ہی سے انھیں فرصت کہاں تھی۔ لیکن اس بات سے میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ مولانا نے مجھ سے بڑے پیار بھرے لہجہ میں فرمایا کہ میاں نسیم! پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ میری اہلیہ یہاں کے تمام علاقوں سے واقف ہیں، جب بھی ضرورت ہو انھیں اطلاع کر دو۔ اور میرے بچوں سے بھی تم ہر طرح کا تعاون لے سکتے ہو۔ مجھے اس کس مپرسی کے عالم میں مولاناؒ کی بات سے بڑی ڈھارس بندھی اور پھر میں نے دیکھا کہ جہاں محترم مولاناؒ بذاتِ خود وقتاً فوقتاً گھر تشریف لا کر خیر و عافیت معلوم کرتے رہے ہیں۔ مولانا کی اہلیہ محترمہ نے میری بیوی کی علالت میں دل و جان سے خدمت کی اور ہسپتالوں اور ڈاکٹروں کے چکر کاٹے اور پھر ساتھ ہی مولانا کے بچوں نے جس محبت اور لگن سے خدمت کی وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ مولانا کے لڑکے میرے گھر کا سودا سلف تک لاتے تھے اور مجھے کبھی غیریت و اجنبیت کا احساس نہ ہونے دیتے تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا مجھے اپنے گھر کا ایک ممبر تصور فرمانے لگے اور مولانا کے جملہ گھر والوں نے اس سلسلہ میں مولانا کا مکمل ساتھ دیا۔

اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں ہمارے لیے بڑا سبق ہے اور وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

ہمارے یہاں ایک یتیم لڑکی تھی بالکل لاوارث۔ اس کا رشتہ جن صاحب سے طے کیا گیا وہ بھی معاشی طور سے بہت پریشان اور بہت ہی تنگ دست تھے۔ میں خود تنہا دونوں طرف کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے میرا ارادہ تھا کہ کچھ اصحابِ خیر کو آمادہ کروں کہ اس کارِ خیر میں حصہ لیں تاکہ یہ کام بحسن و خوبی انجام پائے اور اس بچی کو اپنے یتیم اور لاوارث ہونے کا احساس نہ ہو۔ میں نے اپنی حد تک لوگوں کو اس پر متوجہ کیا، بلاشبہ بعض حضرات نے میری اپیل پر بقدر توجہ دی لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ عرسوں، جلسے جلوسوں اور شادی بیاہ کے غلط رسم و رواجوں پر بے تحاشا خرچ کرنے والی ملت نے اسے لائقِ اعتنا نہ سمجھا۔ شادی کے دن جوں جوں قریب آتے گئے، میری الجھن اور پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ حسبِ معمول میں مولانا سید حامد حسین صاحبؒ کے گھر ملاقات کے لیے گیا۔ مولانا نے محبت سے مجھے بٹھایا، چند ہی لمحوں بعد چائے کی پیالی بھی سامنے آگئی۔ مولانا نے میرے ذہن کی پریشانی کو بھانپ لیا اور مجھ سے میری پریشانی دریافت کی۔ تفصیل سے میں نے مولانا کو صورتِ حال بتائی۔ مولانا کی اہلیہ محترمہ جنھیں میں امی کہتا ہوں اور گھر کے دیگر افراد بھی پاس ہی موجود تھے۔ مولانا نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیرتے ہوئے فرمایا۔ میاں اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ میں لڑکی والا بن جاتا ہوں اور تم لڑکے والے بن جاؤ۔ اور اس طرح سے یہ کام انشاء اللہ بحسن و خوبی جیسا تم چاہتے ہو انجام پا جائے گا۔ اور پھر مولانا نے اپنے لڑکوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ بھئی فلاں تاریخ کو تمھاری بہن کی شادی ہے اور تم لوگوں کو اس میں بھرپور حصہ لینا ہے اور پھر میں نے دیکھا کہ مولانا کے گھر اپنی دینی بیٹی اور بہن کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور شادی سے قبل ایک روز مولانا نے سامان کی ایک لسٹ میرے سامنے رکھ کر فرمایا یہ سامان ہم نے تیار کر لیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر مولانا کی عظمت اور ان کے اہلِ خانہ کی بڑائی کا احساس ہوا کہ انھوں نے واقعی ایک بیٹی کی طرح سامان کی فراہمی کی تھی اور پھر محترم مولانا نے اپنے قریبی اعزا کو بھی "اپنی بیٹی" کی شادی میں باقاعدہ مدعو کیا اور اللہ کے فضل و کرم سے یہ کام بحسن و خوبی انجام پایا۔ الحمد للہ شادی کے بعد بھی اس نئے جوڑے سے مولانا کا تعلق بیٹی داماد کا رہا۔

صباح الدین اعظمی فلاحی

سیّد صاحبؒ - کچھ یادیں کچھ باتیں

مولانا کی زندگی حقیقتاً اسلام کے لیے وقف تھی۔ راقم کا قلم اس بات سے قاصر ہے کہ ان کی تحریکی زندگی کے حالات قلمبند کر سکے۔ چند بکھرے ہوئے تاثرات ہیں جن کو یکجا کر کے پیش کرتا ہوں۔

مولانا مرحوم نے راقم کو ایک مرتبہ پوچھنے پر بتلایا تھا کہ ابتدا ہی سے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ اس وقت کے ماحول، افکار و خیالات سے پوری طرح متاثر اور اپٹوڈیٹ زندگی تھی لیکن بھلا ہو ادبی ذوق جس کی وجہ سے مشاعروں میں شرکت کرنے لگا اور حال یہ ہو گیا کہ چاہے مشاعرے پچاسوں میل دور ہوں، شرکت ضروری تھی۔ اسی عادت اور شوق نے شاعرِ مشرق کے اشعار پڑھنے پر آمادہ کیا اور بالآخر حکیم الامت کے اشعار نے مجھ کو دین کی طرف متوجہ کیا چنانچہ مطالعہ بسیار کے بعد ۱۹۳۹ء میں تحریکِ اسلامی میں شامل ہو گیا۔

۸۵ سال کی عمر میں بھی مولانا اتنے ہی مستعد اور چاق و چوبند رہتے تھے کہ ایک نوجوان۔ مسلسل سفر کرنا شاید ان کی قسمت میں تھا ان کی زندگی مسلسل سفر میں کٹی یوں تو زندگی سفر ہی سے عبارت ہے لیکن مسلسل تحریکی دورے کرتے، دعوتی تقاریر کرتے، میٹنگوں میں شرکت کرتے سیمینار میں لکچرس دیتے رہے اور یہ سلسلہ عمر کے آخری دور تک جاری رہا۔ مجھے ان کی وہ تقریر آج تک یاد ہے جو کہ انھوں نے مسلم پرسنل لا کے سلسلے میں ۸۵ء ملکفوڈویژن کے اجتماع کے موقع پر کی تھی۔ اس کے بعد وہ دہلی چلے گئے تھے وہاں سے حجاز اور بالآخر مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

مولانا سے گفتگو کرتے وقت یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسلام کے غلبے اور اسلام کی دعوت کو عام کرنے کیلئے کتنا کوشاں رہتے تھے۔ ان کی زبان سے میں نے داعیوں کے لیے دعائے خیر ہی نکلتے سنا۔

مولانا کی ایک اہم خصوصیت میرے نزدیک یہ تھی کہ وہ ہر عمر کے لوگوں میں یکساں طور سے مقبول تھے۔ اگر وہ جماعت کی مرکزی شوریٰ اور مسلم مجلس مشاورت کے رکن تھے تو ساتھ ہی

ساتھ وہ طلبہ کی تنظیموں کے اجلاس میں بھی شرکت کرتے تھے۔ نوجوانوں پر بے حد شفقت کا اظہار کرتے اور ان کی برابر ہمت افزائی کرتے تھے

اپنی ان تمام خصوصیتوں کے باوجود مولانا ایک زاہد خشک نہ تھے۔ ان کے اندر مزاح کا پہلو بھی تھا جب کبھی مولانا مزاح پر اتر آتے تو مجلس دلچسپ ہو جاتی ان کو لطیفے سنانا بھی آتا تھا۔ شعر بھی سناتے تھے اور ایک آدھ دفعہ ترنم سے۔

جنوری [illegible] میں بلریا گنج اعظم گڈھ کے سماج سدھار کیمپ کے تین روزہ تھکا دینے والے پروگرام کے بعد مولانا نے خواہش ظاہر کی کہ پکنک منائی جائے بس پھر کیا تھا ہم لوگ فوراً تیار ہو گئے مچھلی پکڑنے کے لئے ڈور کانٹے اور جال رکھا گیا۔ ناشتہ کا سامان ساتھ لیا گیا۔ ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹس رکھے گئے اور پھر ہم لوگ پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ گاؤں کے باہر باغیچے میں پروگرام رکھا گیا۔ اس دن ان کی سنجیدہ زندگی کا ایک دوسرا ہی رخ ہمارے سامنے آیا۔ تالاب کے کنارے قلمی آم کے سائے میں نرم زمین پر استراحت فرما مولانا اس دن دوسرے ہی موڈ میں تھے۔ جاڑے کی اس چمکیلی صبح ہم پر آشکار ہوا کہ اس سنجیدہ اور شعلہ بیان خطیب میں ایک دلچسپ انسان بھی پوشیدہ ہے اس خوش گوار صبح مولانا نے چند بہترین نظمیں ترنم سے سنائیں جس کو میں نے کیسٹ کے فیتے پر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا۔ حسین آزاد کی تصنیف آب حیات سے دلچسپ واقعات سنا کر مجلس کو زعفران زار بنایا۔ اس دن مولانا نے بہت سے لطیفے سنائے اور جب دوپہر کے وقت ہم لوگ لوٹے تو اس دن مولانا ہماری نظروں میں کچھ اور زیادہ ہی عظیم ہو گئے تھے۔

جدید طبِ علاج

آسان اردو زبان میں ڈاکٹری کی بہترین اور جدید معلومات سے لبریز کتاب ● ۳۰۰ سے زائد امراض کے اسباب۔ علامات اور مجرب علاج ● اعضائے جسمانی کی تشریح و فوٹو قیمتی معلومات: مثلاً بلڈ پریشر دیکھنا انجکشن لگانا۔ اسٹیتھو اسکوپ لگانا۔ انیما۔ کیتھیٹر۔ تھرمامیٹر لگانا وغیرہ ● ۳۰ سالہ مطالعہ اور تجربات کی روشنی میں ● مطلب کو ذہن نشین کرا دینے کے گر ● بیش قیمت معلومات سے بھرپور کتاب جس کا مطالعہ ایک کامیاب طبیب بننے کیلئے ضروری ہے ● دلکش کتابت نفیس طباعت آفسیٹ ۔۔۔ صفحات مع مجلد اور قیمت ۳۰ روپے

پتہ۔ ڈاکٹر عبدالجبار پوسٹ۔ ٹی ارک۔ ضلع رہیل بھیت

مظفر حسین

خطیبِ ہند

مولانا سید حامد حسینؒ کو [illegible] میں اس ناچیز کو قریب سے دیکھنے سمجھنے اور سننے کا موقع ملا۔ کیا عرض کروں ان کے تجربات، مشاہدات اور عزم و یقین کہ بے اختیار یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

یقیں کے ساتھ جب عزم جواں سے کام لیتا تھا
مسلماں مسکرا کر بجلیوں کو تھام لیتا تھا
تھکے سے زمین و آسماں کے دل دہلتے تھے
اثر کر معرکوں میں جب خدا کا نام لیتا تھا

ہم نے سیکر والوں کی اس رائے پر کہ رات کو یہاں کوئی تقریر نہیں سنتا۔ بعد عصر تقریر کا اعلان شائع کرا دیا۔ مولانا نے دیکھ کر فرمایا کہ یہ کیا طریقہ ہے تقریر شباب پر آئے گی تو مغرب کا وقت ہو جائے گا آپ بعد عشاء تقریر رکھئے۔ مقامی رفقا نے بہت سمجھایا لیکن مولانا نے فرمایا آپ ہمارے تجربہ سے فائدہ اٹھایئے سب نے کہا کوئی نہیں آئے گا فرمایا کوئی حرج نہیں مظفر حسین، سراج الدین، عبدالرزاق، لیاقت علی تو ہوں گے مجھے کسی کی ضرورت نہیں مگر واقعی جب اس پر عمل کیا گیا تو وہ منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے کہ پہلے ہندی تقریر تھی، مجمع بے تاب تھا۔ مولانا نے اسے مختصر کروا کر جب اپنے مخصوص انداز میں تقریر فرمائی تو کیا عرض کروں۔

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ!
حقیقت خود ہی منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

سیکر میں اس سے بڑا مجمع کبھی نہیں ہوا اور جب سامعین کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تو پاس ہی مندر والوں نے دریاں پھینکیں اور کہا کہ اس کو بچھائیے اور پبلک کو بٹھائیے یہ تقریر کھڑے کھڑے سننے کی نہیں مگر افسوس کہ وہ تقریر ٹیپ نہ ہو سکی۔

اسی طرح مولانا کی ایک تقریر جودھپور میں ہوئی تو ایک غیر مسلم پکار اٹھا کہ اگر اسلام یہی ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا۔

شہادت حسین پر مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی تقریر سامنے ہے اور مولانا مودودیؒ کی بھی مگر ذرا مولانا سید حامد حسینؒ کا چھوتا انداز ملاحظہ فرمائیں مولانا اس وقت قیم جماعت تھے اور رات کو اسماعیل پارک لال ڈگی گورکھپور میں خطاب فرمایا تھا۔

"سینکڑوں برس سے دنیا کے کروڑوں مسلمان محرم کے دنوں میں حسین ابن علیؓ کی یادگار مناتے ہیں۔ جو دو گروہوں میں منقسم ہیں ایک گروہ وہ ہے جو شہادت سے متاثر ہو کر نفرت سینکڑوں گیلن بہا دیتا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے جو آنسوؤں کا دریا بہا دیتا ہے اور یہ دونوں گروہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہم نے عقیدت و محبت کا حق ادا کر دیا جس عظیم مقصد کیلئے حضرت امام حسینؓ یزید کے توڑے ہوئے ظلم اور ہر طرح کی تکلیف اور بھوک پیاس برداشت کرتے ہوئے شہید ہوئے کیا آپ کی شہادت کا مقصد یہی تھا کہ ملت اسلامیہ آج کو دیسا بھونڈا طریقہ اختیار کر کے اس عظیم مقصد کی یادگار منائے۔ ملت اسلامیہ اس عظیم مقصد کو بھول جائے یہ کتنا بڑا ظلم ہے" الخ

گنگا نگر میں وکلاء اور معززین شہر کے سامنے مولانا کی تقریر تھی۔ تقریر بڑی شاندار ہوئی اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ بڑا متاثر ہوا بعد میں جب سوال و جواب کا موقع دیا گیا تو ڈاکٹر رتن چند جو انگریزی داں بھی تھے اور شاعر بھی، سوال کیا "اقبال وطن پرستی پر شعر کہتے ہیں مگر عملاً ایسا نہیں ہے" مولانا نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ "وہ محب وطن بنانا چاہتا ہے نہ کہ وطن پرست اور حب الوطنی پر ہمارا ایمان ہے"۔

علامہ مودودیؒ کے انتقال پُر ملال پر مختلف شعراء نے جو اشعار نظم کیے

ہیں ان میں سے مولانا سید حامد حسینؒ کے نام کے ہر حرف پر ایک ایک شعر
منتخب کر کے پورا نام پر اشعار

ضرورتاً کہیں کہیں الفاظ میں کمی بیشی کی گئی لہٰذا اس شاعر سے معذرت کے ساتھ

مظفر حسین

م	مکہ کی سرزمین میں وہ پیوند خاک ہے	کل تک رہا جو رشد و ہدایت کا ماہتاب
و	وہ طبیب چارہ گر خود سو گیا	جس نے امت کا کیا برسوں علاج
ل	لے کے حق کا علم وہ بڑھا ہے جدھر	کر گیا قصر باطل کو زیر و زبر
ا	اور بھی دنیا میں آئیں گے مفسر نامور	ہو بہو کھینچے گا لیکن دین کی تصویر کون
ن	نوجوانوں کو شہباز کے پر دیے	اپنے افکار کے لعل و گہر دیے
ا	آہ وہ مرد مجاہد کفن پوش ہے	اب لحد سے وہ اپنی ہم آغوش ہے
س	سید کی موت علم کی حکمت کی موت ہے	ایثار و علم و خلق و شرافت کی موت ہے
ی	یارب وہ تیرے دین کی عظمت کا اک نشاں	اپنوں کے جور و ظلم کا مارا کدھر گیا
د	دل جس کے غم میں خون کے آنسو بہا رہا	کوئی مجھے بتاؤ خدارا کدھر گیا
ح	حامیٔ دین متین قانون حق	ظلمت باطل میں تابندہ سراج
ا	اس دور کے عظیم مفسر نے اے خدا	کیوں کر دیا ہے ہم سے کنارا کدھر گیا
م	مظفر تو آج شدت غم سے نڈھال ہے	تسکین جاں بجھ گئی لطف بیاں چلا گیا
د	درد مندی کا یہ معیار کہ ہر درد ترا	اجنبی سب کو لکھوں اور تجھے اپنا لکھوں
ح	حاصل رہا ہے مجھ کو ملاقات کا شرف	مٹی کا اک چراغ تھا سورج سے فیضیاب
س	سرمایۂ افکار تیرا زندہ رہے گا	اخلاص و عمل روشن و تابندہ رہے گا
ی	یہ بستی ہستی کی دنیا کیوں موت کا گھڑی بیعاد	جس پر بھی پڑی کہ جان وہیں جل دیتا ہے ہر کہ گاہ
ن	نازاں تھا جس پہ لفظ مروت چلا گیا	زندہ تھی جس کے دم سے شرافت چلا گیا

مظفر حسین۔ مظفر کلینک اے / ۲۰ ارونودیتھ مری گنگا نگر ۳۳۵۰۰۱

نے
لکھا

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

زندگی کا سفر موت کی دہلیز پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ اس دنیا کی اٹل حقیقت ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جو کسی استثنیٰ سے نا آشنا ہے۔ اس عالم آب و گل میں جو آتا ہے اسے حیات مستعار کے دن پورے کرکے ایک نہ ایک دن سارے رشتے ناطے توڑ کر یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد صرف اس کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں جو کبھی اپنوں کی آنکھوں سے اشک خوں کی شکل میں ٹپک پڑتی ہیں تو کبھی ایک بے نام سے درد کی ٹیسیں بن کر سینے میں تلاطم برپا کر دیتی ہیں۔ سید حامد حسین صاحب جنھیں آج مرحوم و مغفور لکھتے وقت قلم کانپ کانپ جاتا ہے ان لوگوں میں سے تھے جن کے "اپنوں" کا دائرہ بہت ہی وسیع بلکہ پورے ملک پر محیط تھا۔ ہندوستان میں تحریک اسلامی کے کاروان کے ہر فرد کے لیے وہ "اپنے" تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو اسلام کی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ ایک بلند پایہ خطیب بھی تھے اور قلم کے دھنی بھی۔ تحریک اسلا وابستگی کے بعد سے انھوں نے زبان و قلم کی تمام تر صلاحیتوں کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اس راہ میں نہ کبھی خانگی ذمہ داریاں رکاوٹ بنیں نہ ضعف و علالت۔ وہ جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے اور اترپردیش کے امیر حلقہ بھی۔ ان دونوں حیثیتوں میں جو ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں انھوں نے انھیں جس طرح نبھایا وہ بس انھیں کا حصہ تھا۔ عمر کا آخری حصہ یوں بھی کچھ کم مسائل نہیں پیدا کرتا رہتا ہے اور اگر ساتھ میں کچھ مستقل قسم کی بیماریاں بھی ہوں تو معاملہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں کم ہی لوگ ہوتے ہیں جو سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے، مسلسل دورے کرنے اور مختلف پروگراموں میں شرکت کرنے

کی اپنے اندر ہمت پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن سید صاحب آخر وقت تک یہ سب کچھ کرتے رہے۔ اپنے مقصد پر غیر متزلزل یقین، اپنے مشن سے غیر معمولی محبت اور آخری سانس تک دین حنیف کی خدمت کرتے رہنے کا بے پناہ جذبہ، انھیں شہر شہر، قریہ قریہ لیے پھرا۔ اس راہ میں زمانوں کی تیرہ و تار گھڑیاں بھی آئیں اور مختلف نوع کی آزمائشوں کے کٹھن اور جان لیوا مراحل بھی۔ لیکن ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہیں آئی۔

وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کی یاد، ان کا عزم و حوصلہ، ان کی لگن اور دین کی خدمت کا ان کا بے پناہ جذبہ ہم سب کے لیے تحریک اسلامی کے کاروان کے ایک ایک فرد کے لیے اس ملک میں اسلام کی سربلندی سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے ایک بیش قیمت سرمایہ ہے جو ہمارے لیے حرکت و عمل کا محرک بن سکتا ہے اور بننا چاہیے۔ آیئے دعا کریں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ مرحوم کی مساعی کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور اپنی بہترین نعمتوں سے نوازے۔ نیز ہمیں دین حنیف پر ثابت قدم رکھے اور اس کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے کہ یہی اس زندگی کا سب سے بہتر مصرف بھی ہے اور کامیابی و کامرانی کی شاہ کلید بھی۔ یہ راہ مشکلات و مصائب کے خارزاروں سے بھی گزرتی ہے اور ابتلا و آزمائش کی تاریک وادیوں سے بھی اس راہ میں محرومیوں کو بھی گلے لگانا پڑتا ہے اور اپنوں اور غیروں کے طعن و تشنیع کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے لیکن یہ سب تو عارضی ہے۔ اصل زندگی تو وہ ہے جو موت کی دہلیز پار کرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ حقیقی کامیابی و کامرانی وہی ہے جو اس زندگی میں حاصل ہو۔ کامیاب و کامران ہیں وہ لوگ جنھوں نے اس دنیا پر حیات اخروی کو ترجیح دی اور اپنے لیے وہ زاد راہ اکٹھا کیا جو آخرت میں کام آنے والا ہے۔

سید حامد حسین صاحب کی مکہ مکرمہ میں رحلت، قبرستان جنت المعلیٰ میں تدفین

اسلام کی سربلندی کا پیغام عام کرنے والی صدا خاموش ہو گئی

تحریک اسلامی کا عظیم مجاہد رخصت، مسلمانان ہند کا نقصان

دہلی — تحریک اسلامی ہند کے عظیم سپاہی، امیر جماعت اسلامی ہند حلقہ اترپردیش اور رکن مرکزی

مجلس شوریٰ جناب سید حامد حسین صاحب کا حج بیت اللہ کی سعادت سے سرفراز ہونے کے بعد ۱۰ ستمبر کو انتقال ہوگیا۔ اِنّا للہ و اِنّا اِلیہِ راجعون۔ موصوف کو مکہ مکرمہ کے قبرستان جنت المعلیٰ میں دفن کیا گیا۔ امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی جو حج بیت اللہ سے فراغت کے بعد ۳ ستمبر کو وطن واپس پہنچنے والے تھے اپنے دیرینہ رفیق کی رحلت کی خبر پاکر رک گئے ہیں اور ان کی تدفین میں شریک ہونے کے بعد ۵ ستمبر کو انشاء اللہ مرکز واپس آئیں گے۔

مرکز جماعت میں موصوف کے انتقال کی خبر انتہائی افسوس کے ساتھ سنی گئی۔ فوری طور پر مرکزی قائدین اور رفقائے جماعت نے دہلی میں سید حامد حسین صاحب کے گھر پہنچ کر ان کی اہلیہ اور صاحبزادگان سے تعزیت کی اور انھیں تسلی و تشفی دلائی۔

قائم مقام امیر جماعت اسلامی ہند مولانا عروج قادری صاحب، قیم جماعت جناب افضل حسین صاحب اور سکریٹری جماعت جناب محمد شفیع مونس صاحب نے جناب سید حامد حسین صاحب کی رحلت پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور ان کے انتقال کو تحریک اسلامی ہند اور ملت و وطن کا عظیم نقصان بتایا ہے۔ ان حضرات نے مرحوم کی مغفرت اور بلندی درجات کی دعا بھی کی ہے۔

جناب سید حامد حسین صاحب مرحوم کی تحریکی زندگی بہت طویل رہی ہے۔ موصوف آزادی کے بعد سے جماعت اسلامی ہند سے وابستہ ہوگئے تھے اور ۱۹۵۲ء سے ہی بیشتر وقت جماعت کے مختلف مناصب پر مامور رہے اور جماعت کے آل انڈیا سکریٹری کی حیثیت سے اکثر و بیشتر ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کرتے رہے اور جماعت کی دعوت اور اس کے پیغام کو اپنی منفرد خطیبانہ شان کے ساتھ ملک کے عوام کے سامنے پیش کرتے رہے۔ اس وقت موصوف امیر جماعت اسلامی ہند حلقہ اترپردیش تھے اور رخصت لے کر حج بیت اللہ کے لیے گئے ہوئے تھے۔ آپ کے انتقال سے دراصل چالیس سال تک اسلام کی سربلندی کا پیغام عام کرنے والی ایک مضبوط صدا خاموش ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ دین کی راہ میں ان کی مسلسل جدوجہد کو شرف قبولیت بخشے اور ان کی مغفرت فرماکر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ قیم جماعت جناب افضل حسین صاحب نے رفقاء و متوسلین جماعت سے بھی مرحوم کی مغفرت اور بلندی درجات کی دعا کرنے کی

درخواست کی ہے۔

سید حامد حسین صاحب کی رحلت جماعت کا بڑا نقصان

مرکز جماعت کے اجتماع میں امیر جماعت مولانا ابواللیث صاحب کا اظہار خیال

دہلی۔ ۲۸ ستمبر۔ امیر جماعت اسلامی ہند محترم مولانا ابواللیث صاحب ندوی اصلاحی نے حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد آج مرکز جماعت میں رفقاء مرکز اور دیگر شعبہ جات کے ارکان جماعت کے ماہانہ اجتماع میں رکن مرکزی مجلس شوریٰ اور امیر جماعت اسلامی اترپردیش سید حامد حسین صاحب کے انتقال کی تفصیل بتاتے ہوئے اس کو جماعت کا عظیم نقصان بتایا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ مرحوم کی مغفرت کرے اور ان کی رحلت سے جماعت میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی تلافی فرمائے۔ آپ نے رفقاء کو بھی مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرنے کی طرف متوجہ فرمایا۔ مولانا نے فرمایا کہ اگرچہ موصوف کی جدائی ہم سب کے لیے صدمہ و رنج کا سبب بنی ہے لیکن حرم شریف میں ان کی نماز جنازہ اور اس کے قریب ہی کے قبرستان میں ان کی تدفین قابل رشک ہے۔

امیر جماعت نے فرمایا کہ حج سے قبل جدہ پہنچنے پر حامد حسین صاحب سے ملاقات ہوئی تھی اس وقت موصوف کی صحت بہتر تھی لیکن حج کے فریضہ کی ادائگی کے بعد میں ریاض میں تھا کہ مرحوم کی مدینہ منورہ سے جدہ واپسی پر اچانک یہ اطلاع ملی کہ وہ ہیں ۱۹ ستمبر کو وہ خود اور ان کے صاحبزادے سید لیاقت حسین ایک کار حادثہ میں زخمی ہوکر داخل اسپتال ہیں۔ مولانا نے بتایا کہ کسی چوراہے پر سگنل کے انتظار میں کھڑی ہوئی ان کی کار سے ایک دوسری کار غلط طریقہ سے آکر ٹکرا گئی جس سے یہ حادثہ پیش آیا۔ حامد حسین صاحب نے حادثہ کے بعد اسپتال میں رفقاء اور احباب سے ملاقات بھی کی اور ان سے گفتگو بھی کی لیکن رات میں ان کی طبیعت بگڑ گئی اور ۲۰ ستمبر کی صبح ہی وہ اپنے رب حقیقی سے جاملے۔ حادثے کی خبر پر امیر جماعت ۲۱ ستمبر کو مرکز واپسی پر اپنا پروگرام ملتوی کرکے پہلے ریاض سے جدہ تشریف لائے اور پھر ۲۳ کو حرم شریف میں ان کی نماز جنازہ اور تدفین میں شرکت کے بعد ۲۵ ستمبر کو دہلی واپس آئے۔ مولانا نے بتایا کہ حرم شریف میں مغرب کی نماز میں موجود کافی بڑے مجمع کے ساتھ اس وقت وہاں مختلف

شہروں میں موجود رفقاء و متوسلین جماعت نے نمازِ جنازہ اور تدفین میں شرکت کی۔ امیرِ جماعت دہلی واپسی پر رفقاء کی معیت میں ہوائی اڈہ سے براہ راست جناب سید حامد حسین صاحب مرحوم کے گھر تشریف لے گئے اور ان کی اہلیہ محترمہ سے جو خود بھی رکن جماعت ہیں اور ان کے صاحبزادگان اور دیگر اعزہ سے تعزیت کی اور تسلی و تشفی دی۔

مرکزِ جماعت اور دفترِ دعوت میں ملک اور بیرونِ ملک کے مختلف افراد اور تنظیموں کے ذمہ دار افراد کی طرف سے تعزیتی خطوط اور تار وغیرہ موصول ہو رہے ہیں۔ جس میں مرحوم کی رحلت کو دین و ملت کا عظیم نقصان بتایا گیا ہے اور دین کی راہ میں ان کی خدمات کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا جارہا ہے نیز ان کی مغفرت اور درجات کی بلندی کی دعا کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگذر فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

معلّم

معلّم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجہ کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری معلّم کی کارگزاری ہے۔ معلّموں ہی سے علم کا سچا عشق پیدا ہوتا ہے۔ اسی میں تمدنی اور سیاسی برتری مخفی ہے جس سے قومیں معراجِ کمال تک پہنچ سکتی ہیں۔

(علامہ اقبالؒ)

از مضمون "بچوں کی تعلیم و تربیت"
تحریر ۱۹۰۲ء

"ایک صاحبِ خیر"

حکیم محمد ایوب۔ بلریا گنج

پاک دل و پاکباز

برادرِ عزیز طارق فارقلیط صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ میں حیاتِ نو کے سید صاحب نمبر کے لیے کچھ لکھوں۔ پر میں نے آج تک کوئی مضمون نہیں لکھا ہے مگر سید صاحب مرحوم سے دلی لگاؤ اور آپ کی خواہش کے احترام میں چند سطریں حاضرِ خدمت ہیں۔

جب سے جماعتی زندگی میں قدم رکھا ہے سید صاحب کی شخصیت ہی ہمارے سامنے نمایاں رہی ہے۔ تحریک اسلامی ہند کے انقلابی لٹریچر کے بعد شخصی طور پر تحریک اسلامی کے فروغ میں اگر کسی نے نمایاں کردار ادا کیا ہے تو وہ سید صاحب کی ذاتِ گرامی ہے۔ ان کی تقاریر، ان کے درسِ قرآن، ان کے افتتاحی اور اختتامی کلمات، ان کے سمپوزیم، ان کی پریس کانفرنسوں نے لاکھوں آدمیوں کے دل ہلا کر رکھ دیے ہیں۔ لوگ مبہوت ہوکر ان کے منہ کی طرف تکتے ہوئے غور سے اُن کی باتیں سنتے تھے۔ کیا مسلم، کیا غیر مسلم، متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

ایک طویل مدت تک وہ ہمارے امیرِ حلقہ رہے ہیں۔ اس درمیان ان سے تعلق اور قریب کا رہا ہے۔ میں اکثر محسوس کرتا تھا کہ وہ مجھ پر بہت شفیق ہیں۔ وہ نہایت ہی صاف دل اور صاف طبیعت کے آدمی تھے۔ پاک دل و پاکباز۔ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں پر پکڑ بھی کرتے رہے ہیں، یہی باتیں کچھ لوگوں کو ناگوار گذرتی تھیں اور کچھ لوگوں کو بہت بھلی بھی لگتی تھیں۔ ایک بار تمام مقامی امراء کو لکھا کہ بیت المال کا رجسٹر لے کر فلاں تاریخ کو دفترِ حلقہ لکھنؤ پہنچیں۔ بلریاگنج بیت المال کا رجسٹر ایک رفیق کے ذمہ تھا۔ وہ لے کر گئے۔ رجسٹر چیک کیا اور ان سے کہلوایا کہ میں نے امیرِ مقامی کو بھی بلایا تھا۔ رجسٹر تو آگیا مگر امیرِ مقامی والی بات پوری نہیں ہوئی۔ میں اسی دن لکھنؤ کے لیے چل پڑا۔ دوسرے دن صبح دفترِ حلقہ پہنچا، دیکھ کر مسکرائے، بولے، مقصد جمود کو توڑنا ہے۔ اطاعتِ امر کا امتحان لینا تھا۔

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانا

وہ خود پروگرام کے مطابق ضرور پہنچتے تھے۔ دیے ہوئے پروگرام پر تقریر ضرور کرتے تھے۔ بیماری کا عذر مانع نہیں ہوتا تھا۔ دورانِ تقریر پسینہ چھوٹنے لگتا شیروانی بھیگ جاتی، آثار دیتے مگر تقریر جاری رکھتے۔ دورانِ تقریر اگر احساس ہو جاتا کہ حکومت کے لوگ ان کی باتیں نوٹ کر رہے ہیں تو ان کی تقریر کی روانی اور بڑھ جاتی، اور حق گوئی اور بیباکی کا منظر قابلِ دید ہوتا تھا

کسی قیصر کسی کسریٰ کو خاطر میں نہیں آتے — غلامانِ محمدؐ کی ادا سب سے نرالی ہے

نجی محفلوں میں زیادہ تر تذکرہ سید مودودیؒ کا فرماتے۔ ان کے بارے میں نظمیں سناتے، ہنستے اور ہنساتے بھی۔ بہت صاف ستھرا ذوق تھا۔ اپنا سامان خود درست کرتے بلکہ خود باندھتے اجتماعات میں سب کے ساتھ کھاتے سب کے ساتھ سوتے۔

کھانا جو بھی ہوتا ذوق سے کھاتے۔ کبھی شکایت نہیں کرتے۔ وہ گوشت اور کھٹائی زیادہ پسند فرماتے۔

ایک بار حلقہ کی شوریٰ کے اجتماع میں گیا تو ان کے لیے مربے کا اچار لے گیا جو اُن کو بہت مرغوب تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کی زندگی ہم لوگوں کو کتنی عزیز ہے آپ کو اندازہ نہیں ہے مگر پھر بھی آپ کی خواہش کے مطابق آپ کے لیے زہر لایا ہوں۔ دیکھ کر ہنسے، بولے۔ "یہ تو میری زندگی ہے۔" ہم لوگ ان کو کہتے کہ یہ مضر ہے چھوڑ دیجیے، یہ چھوڑ دیجیے تو ہنستے اور کہتے کہ موت کا وقت مقرر ہے وقت پر آجائے گی۔ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے۔

کیا ٹھکانا ہے زندگانی کا — آدمی بلبلا ہے پانی کا

عربوں کی طرزِ معاشرت کے بہت شائق تھے بلکہ ارضِ مقدس پر موت کے متمنی تھے۔ اللہ نے ان کی یہ آرزو پوری کی اور اپنے گھر بلا لیا اور حج سے فارغ ہونے کے بعد گناہوں سے دھل دھلا کر جب اپنے کنجِ قفس کی طرف پرواز کا ارادہ کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس مردِ مومن کی آرزو پوری کر دی اور اسی ارضِ مقدس پر موت آئی اور حرم شریف میں جنازہ نصیب ہوا۔ اور وہیں کے قبرستان میں آرام فرما ہیں۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ ؏

جب نام ترا لیجیے تب اشک بھر آئے

سرزمینِ ہند کا

آخری خط

اس خط کا پس منظر یہ ہے کہ انصاری باغ فساد و قتلِ عام کا مقدمہ چل رہا تھا جس روز (۱۷ جون ۱۹۸۵ء) شہادت دینے گیا شام میں کورٹ کے احاطہ میں ہی کچھ لوگوں نے میری کار کا محاصرہ کر لیا اور دھمکی دی کہ اگر اور کوئی گواہ لایا تو تمہیں وہیں ختم کر دیں گے۔ میں نے اس کی شکایت جج کے علاوہ پولیس کمشنر اور وزارتِ داخلہ تک پہنچائی مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔

میری مولانا مرحوم سے باقاعدہ خط و کتابت کئی سالوں سے جاری تھی۔ میں نے انھیں ایک خط میں لکھا کہ فساد (۱۹ مئی ۱۹۸۴ء) کے موقع پر تو جامِ شہادت لبوں تک آکر چھلک گیا لیکن شاید اب بھی وہ مقدر میں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس سعادت سے نوازا تو میں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھوں گا۔ اسی خط کے جواب میں مولانا نے لکھا تھا۔

(محمد ابراہیم انصاری)

دہلی ۵ اگست ۸۵ء

برادرِ عزیز! سلامتی و رحمت

محبت نامہ مورخہ ۲۴ رماہِ رواں موصول ہوا۔ اللہ تعالیٰ آزمائش میں ثابت قدم رکھے۔ آمین۔

اگر شہادت مقدر میں ہے تو اس سے اچھی نعمت اور کونسی ہو سکتی ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

پھر واقعہ یہ ہے کہ

دولتِ کون و مکاں سنتِ شبیرؑ میں ہے

اور ظاہر ہے کہ حسین ابن علیؓ کی سنت، شہادت کے سوا کیا ہے؟ اللہ سے دعا ہے کہ وہ کاروبار کو بحال کر دے اور نعم البدل عطا کرے۔ آمین۔

اب آئندہ اکتوبر میں آدھی ملاقات ہو سکے گی کیونکہ میں کل رات P.I.A. کی Flight سے براہ کراچی جدہ جا رہا ہوں گنگناتا ہوں کا بوجھ لادے ہوئے سر تحفظ

خدا کے فضل سے میں جا رہا ہوں جانب کعبہ
نظر شرمندہ شرمندہ، بدن لرزیدہ لرزیدہ

حج مبرور کے لیے دعا کریں۔ تندرستی اور صحت کی دعا کی بھی درخواست ہے Cord-iologist کی E.C.G. اور X-Ray اور B.P. رپورٹ کے مطابق Hypertension کے علاوہ Heart کے بعض حصے Block ہو گئے ہیں۔ اللہ اپنا رحم فرمائے۔ آپ کے تمام افراد خاندان کو سلام، احباب و رفقاء کو سلام اور ان سے بھی دعاؤں کی درخواست۔ والسلام

سید حامد حسین

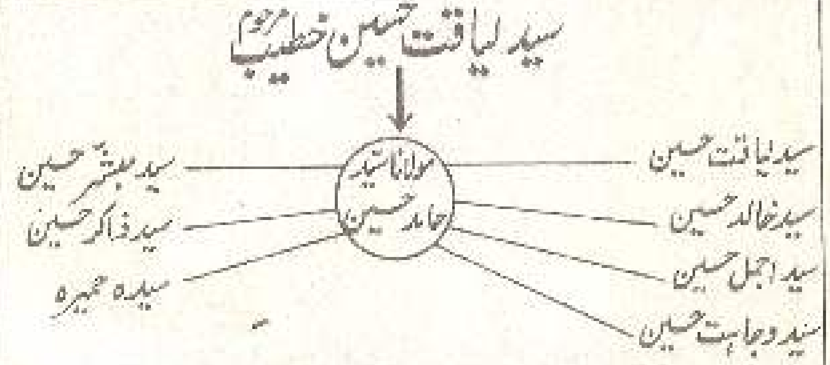

کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل یا سبع سنبلات خضر

تاریخ وفات

آہ نیک دل مولانا سید حامد حسین صاحب کو الٰہی بخش دے اپنے کرم سے

۶ ۱۱۴ ۱۲۹ ۷۴ ۱۸۱ ۱۰۱ ۳۶ ۱۳۵۵ ۱۹۸۵ء

مولانا سید حامد حسین صاحب داعی حق مقرر اعلیٰ درجنت

۴۸۴ ۱۹۳ ۲۵۱ ۲۵۷ ۱۹۸۵ء

مسلم اسکولوں کے لیے اسلامی نصابی کتب

اقرار سیریز

انگریزی

۱۔ اقرار اے بی سی
۲۔ اقرار رائٹنگ بک اول
۳۔ اقرار رائٹنگ بک دوم
۴۔ اقرار رائٹنگ بک سوم
۵۔ اقرار رائٹنگ بک چہارم
۶۔ اقرار ریڈر اول

اردو

۱۔ اقرار اردو قاعدہ
۲۔ اقرار اردو خوشخطی اول
۳۔ اقرار 〃 〃 دوم
۴۔ اقرار 〃 〃 سوم
۵۔ اقرار 〃 〃 چہارم
۶۔ اقرار اردو اول
۷۔ اقرار 〃 دوم
۸۔ اقرار نظمیں اول
۹۔ اقرار 〃 دوم
۱۰۔ نور محمدی
۱۱۔ اقرار اردو سوم
۱۲۔ اقرار 〃 چہارم

حساب

۱۔ اقرار نمبر بک 20 — ۱
۲۔ اقرار نمبر بک 100 — ۱
۳۔ اقرار نمبر س
۴۔ اقرار ٹیبل بک

اسلامک ایجوکیشن

۱۔ چلڈرن بک آف اسلام اول
۲۔ چلڈرن 〃 〃 دوم
۳۔ مسلم کراس ورڈ پزل
۴۔ اسلامک نرسری رائمز
۵۔ اور پر افٹ اول
۶۔ ورک بک آف اور پر افٹ اول
۷۔ اور پر افٹ دوم
۸۔ ورک بک آف اور پر افٹ دوم

ڈرائنگ

۱۔ اقرار کلرنگ بک اول
۲۔ اقرار 〃 〃 دوم
۳۔ اقرار 〃 〃 سوم

بچوں کے لیے اخلاقی کہانیاں

شاہین سیریز

۱۔ انصاف کا کرتب
۲۔ کرتوت
۳۔ جیت کردار کی
۴۔ سچ کی تلاش
۵۔ من کی دنیا
۶۔ احساس
۷۔ روشنی مل گئی
۸۔ سویرے
۹۔ کشمکش
۱۰۔ پیچ پیچ
۱۱۔ آج کل
۱۲۔ ایمان جاگا
۱۳۔ وفاداری
۱۴۔ رنگ برنگ
۱۵۔ کچھ سنا آپ نے
۱۶۔ ڈر کیسا؟
۱۷۔ دو راستے
۱۸۔ کارخانے کا چکر
۱۹۔ بچھو کا پھیر
۲۰۔ تین تارے
۲۱۔ قدرت کا جلوہ
۲۲۔ فرشتے اور شیطان
۲۳۔ استاد و شاگرد
۲۴۔ کامیاب نصیحت

کریسنٹ پبلشنگ کمپنی ۲۰۳۴ قاسم جان اسٹریٹ۔ بلیماران۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

جامعۃ الفلاح میرے خوابوں کی تعبیر ہے

معزز مہمانوں کی آمد۔ تعزیتی اجلاس۔ مسلم پرسنل لاء سے متعلق خصوصی پروگرام۔ ششماہی امتحانات۔

ادھر حال ہی میں جامعہ کے اساتذہ و طلبہ کو بہت سے معزز مہمانوں کی ضیافت، ان سے تبادلہ خیالات و ملاقات نیز افادہ و استفادہ کا موقع ملا ہے۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۸۵ء کی رات میں جماعت اسلامی ہند کے سکریٹری محترم جناب سید محمد یوسف یہاں تشریف لائے۔ موصوف ابھی پہلی مرتبہ یہاں تشریف لائے تھے۔ اعظم گڑھ سے رات کے گیارہ بجے ٹریکٹر کے ذریعہ آئے۔ ان سے مل کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ موصوف کے ذریعہ مولانا سید حامد حسین صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر ملی۔ تمام ہی اساتذہ و طلبہ اور دیگر حضرات نے اس خبر کو انتہائی رنج و غم کے ساتھ سُنا۔ جامعہ کی مسجد میں تعزیتی اجلاس منعقد ہوا جس میں صدر جامعہ اور دوسرے بڑے اساتذہ نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ مرحوم کی تحریکی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔

جناب سید حامد حسین صاحب بارہا جامعہ تشریف لائے۔ یہاں متعدد بار طلبہ کو خطاب کیا۔ جامعہ سے مرحوم کو بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو محترم جناب قاضی اشفاق احمد صاحب جامعہ تشریف لائے۔ موصوف آسٹریلیا میں رہتے ہیں بلکہ وہاں کے شہری ہیں۔ قاضی صاحب نے طلبہ و اساتذہ سے مل کر بے انتہا خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ آپ نے طلبہ و اساتذہ کے سامنے ایک تقریر بھی کی۔ آپ نے فرمایا کہ "میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ جو خواب آج سے ۴۵ سال پہلے دیکھا تھا وہ آج جامعۃ الفلاح کی شکل میں حقیقت بن کر سامنے آیا ہے۔ یعنی یہ کہ ثانوی درسگاہ جامعہ کی شکل میں موجود ہے۔ اس طرح میں آپ کی درسگاہ کے طلبۂ قدیم میں سے ہوں اور طلبہ قدیم کی حیثیت سے خطاب کر رہا ہوں۔" موصوف نے طلبہ کو مشورے دیئے۔ پہلا مشورہ یہ کہ طلبہ اپنے رول کو صحیح کریں کیونکہ اسی پر آئندہ زندگی کا انحصار ہے۔ دوسرا مشورہ یہ کہ اپنا احتساب کریں اور اپنی شخصیت کو خود بنائیں۔ اس کے بعد سوال و جواب کا پروگرام رہا۔ طلبہ نے بہت زیادہ دلچسپی لی اور آپ سے مستفید ہوئے۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے استاذ محترم جناب محمد فضل الرحمن ندوی صاحب تشریف لائے۔ آپ نے رات کو جامعہ میں قیام فرمایا۔ اساتذہ سے تبادلہ خیالات فرمایا۔

صبح کو طلبہ سے خطاب فرمایا جس میں پڑھنے و مطالعہ کرنے سے متعلق مفید مشورے دیئے۔

اکتوبر کے آخر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اعلیٰ استاذ و مفتی جناب مولانا ظہور احمد صاحب ندوی تشریف لائے۔ آپ نے طلبہ سے خطاب فرمایا اور بہت ہی مفید باتیں بتائیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں آپ کے سامنے صرف دو باتیں رکھنا چاہتا ہوں جن میں سے ایک ہے اخلاص اور دوسرے اختصاص۔ طالب علم کے لیے اخلاص یہ ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کو اپنا بنیادی مقصد بنائے اور پھر اس کے لیے وقت صرف کرے، قربانیاں دے، محنت کرے اور جد و جہد سے کام لے۔ پھر یہ کہ آپ تعلیم و تربیت کے لیے خود فیصلہ کریں صرف والدین کے مدرسہ بھیجنے کی وجہ سے علم حاصل نہ کریں۔ جب تک آپ خود فیصلہ نہیں کریں گے آپ کامیاب طالب علم نہیں ہو سکتے۔ آپ نے مزید بتایا کہ اصل چیز طالب علم کا شوق ہوتا ہے۔ اساتذہ کتابیں، کتب خانے تو صرف سہارا بنتے ہیں۔

دوسری بات اختصاص کی بتائی۔ آپ نے فرمایا کہ صرف مختلف علوم و فنون کی تھوڑی تھوڑی جانکاری کافی نہیں ہوتی بلکہ یہ زمانہ اختصاص کا ہے۔ پہلے تو بہت مشکل تھا مگر اب بہت آسان ہے۔ ہر طرح کی کتابیں فراہم ہیں، مختلف سہولیات میسر ہیں۔ اگر طلبہ نے اپنے اندر یہ دونوں چیزیں یعنی اخلاص و اختصاص پیدا کر لیں تو ان کی ہر جگہ مانگ ہے۔ ہر ادارے اور ہر مدرسے میں ان کی قدر ہے۔ بلکہ وہ اپنے حق سے زائد بھی لے سکتے ہیں اور لوگ دینے کے لیے تیار ہوں گے۔

یکم نومبر ۸۵ء کو پندرہ روزہ عربی اخبار الدعوۃ کے ایڈیٹر جناب مولانا سلمان احمد صاحب ندوی تشریف لائے۔ طلبہ نے آپ سے خوب خوب استفادہ کیا۔ موصوف نے طلبہ سے خطاب بھی فرمایا۔ ان کے سامنے خود ان کی اور جامعہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ کسی کو کیا خبر تھی کہ دارارقم کے

چند طلبہ و اساتذہ پوری دنیا میں انقلاب لائیں گے۔ موصوف سے مختلف نوعیتوں کے سوالات بھی کیے گئے آپ نے ان کے جوابات بھی مرحمت فرمائے۔

نومبر کے پہلے عشرہ میں گجرات کے امیر حلقہ جناب مولانا نظام الدین اصلاحی صاحب سابق استاذ جامعۃ الفلاح بھی تشریف لائے۔ آپ نے طلبہ و اساتذہ سے ملاقاتیں کیں۔ طلبہ کو مفید نصیحتیں بھی کیں۔

حلقہ یو-پی کے امیر حلقہ جناب مولانا محمد رفیق قاسمی صاحب بھی تشریف لائے۔ آپ نے طلبہ و اساتذہ سے ملاقاتیں کیں۔

۲۷ر نومبر ۸۵ء کو جناب مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند و سابق ناظم جامعۃ الفلاح تشریف لائے۔ تمام اساتذہ سے اجتماعی ملاقاتیں رہیں۔

اکتوبر کے آخری دس دن مسلم پرسنل لا عشرہ کے طور پر منایا گیا۔ تفسیر و حدیث، فقہ و استفتاء نیز قانون سے واقف اساتذہ نے مسلم پرسنل لا پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی۔ طلبہ پر اس کی اہمیت کو واضح کیا۔ طلبہ کو علمی انداز میں تیار ہونے کی تلقین کی۔ کیونکہ جو لوگ اعتراض کرتے ہیں وہ بے چارے معذور ہیں، وہ نہیں جانتے کہ مسلم پرسنل لا کیا ہے، اس کی اہمیت کتنی ہے۔

جامعہ میں ۲ر دسمبر سے امتحانات شروع ہوکر ۱۰ر دسمبر کو ختم ہوں گے پھر چند دنوں کی تعطیل ہوگی اور اس کے بعد دوبارہ دوسری ششماہی کے لیے تعلیم جاری ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ طلبہ یہاں کے امتحانات میں بھی اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں اور آخری امتحان میں بھی سرخرو ہوں۔ آمین

"شہداء علی الناس ہونے کی حیثیت سے ان کا (مسلمانوں کا) اس ملک میں یہ کردار ہونا چاہیے کہ وہ باشندگانِ ملک کے سامنے اسلام کی قولی و عملی شہادت مؤثر طور پر دیتے رہیں اور اس غرض کے لیے وہ اپنے ایمان کی تجدید، عمل کی اصلاح اور معاشرے کی تطہیر کے ساتھ ساتھ دینِ حق کی حفاظت اور اس کی مدافعت کی کوشش بھی کرتے رہیں۔"

مولانا سید حامد حسینؒ

"ہندوستانی مسلمان کیا کریں ـــــ صفحہ ۲۵"